باقیاتِ اقبالؒ

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال

ناشران

آئینۂ ادب ۔ چوک مینار انارکلی لاہور

بے نیازانہ ز شوریدہ نوایم مگذر
مُرغِ لاہوتم و از دوست پیامے دارد

باقیاتِ اقبالؒ

ترتیبِ اوّل

سیّد عبدالواحد معینی ایم۔ اے (آکسن)

ترمیم و اضافہ

محمّد عبداللہ قریشی

آئینۂ ادب۔ چوک مینار۔ انارکلی۔ لاہور

بار دوم .... سنہ ۱۹۶۶ء

تعداد اشاعت ۱۱۰۰

قیمت فی جلد ...... دس روپے پچاس پیسے

اہتمام

م - ع - سلام

آئینۂ ادب چوک مینار

انار کلی ـــــ لاہور

نقوش پریس - لاہور

نذرِ عقیدت بزبان حضرتِ گرامی

درس ماضی از کتاب حال گیر ساغر از خمخانۂ اقبال گیر

حضرتِ اقبالؔ آں بالغ نظر دارد از بود و نبود ما خبر

ما بہ ذوقِ سوختن کم ساختیم بے خودی را از خودی نشناختیم

آں نوا پردازِ اسرارِ ازل شہسوارِ عرصۂ علم و عمل

بیخودی را در خودی منزل شناس در غبارِ کارواں محمل شناس

از نوائش بزم یورپ در خروش حکمتِ امریکہ او را سفتہ گوش

نالہ ہائے آتشینِ آں حکیم سوخت رختِ فتنۂ اُمّید و بیم

ساخت با دلہا و بودش ہیچ نیست

سوخت دل ہا را و دودش ہیچ نیست

گرامیؔ

عرضِ حال

نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم
حدیثِ عشقِ بے باکانہ گفتم
شنیدم آن چہ از پاکانِ اُمّت
ترا با شوخیٔ رندانہ گفتم

انتساب

مَیں اس مجموعۂ کلام اقبال کو اپنے پیارے جوان مرگ برادر زادہ سیّد عبدالاحد معینی اجمیری ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی سابق سب جج اجمیر کے نامِ نامی پر معنون کرتا ہُوں۔ مرحوم نے اس مجموعہ کی ترتیب میں میری بے حد مدد کی تھی۔

آج مرحوم حیدر آباد (سندھ) میں اپنے پروردگار کی آغوشِ رحمت میں ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو اس مجموعہ کے مطالعہ سے بیحد محظوظ ہوتا۔

اے روشنیٔ دیدۂ روشن چگونہ‌ٔ

من بے تو تیرہ روز و تو بے من چگونہ‌ٔ

بندہ: واحد

پیش لفظ

اس مختصر مجموعے میں حضرت اقبالؒ کے اِس کلام کو شائع کیا جا رہا ہے جو ان کی مطبوعہ تصانیف میں نہیں ہے۔ مُدّتوں علّامہ مرحُوم کا یہ دستور رہا کہ جب کوئی نظم لکھتے تو اس کو کسی رسالے میں اشاعت کے لئے بھجوا دیتے یا کسی دوست کو دے دیتے۔ جب علاّمہ کو اُردو کلام کے پہلے کلّیات کے شائع کرنے کا خیال آیا تو جو نظمیں بآسانی دستیاب ہو سکیں یا جو اُن کو یاد تھیں صرف وہی نظمیں اس میں شامل کر دی گئیں۔ بانگِ درا کی اشاعت سے پہلے اکثر عقیدتمندانِ اقبال کا یہ دستور تھا کہ جب علاّمہ مرحوم کا کلام کسی رسالہ میں شائع ہوتا تو اُس کو جمع کر لیتے۔ علاّمہ کا بیشتر کلام مخزن اور زمیندار میں شائع ہوتا تھا۔ مگر کبھی کبھی پنجاب کے دُوسرے اخبارات میں بھی شائع ہو جاتا تھا۔

غرضکہ اس کلام کا جمع کرنا آسان نہ تھا۔ مگر دلدادگانِ اقبالؒ ہمیشہ تلاش میں رہتے
تھے۔ اور اکثر اصحاب کے پاس بانگِ درا کی اشاعت سے پہلے ہی کلامِ اقبالؒ
کا کافی ذخیرہ موجود تھا۔ اس میں سے ایک شیخ عبدالحمید صاحب ایم۔اے علی گڑھ
میں طالب علم تھے۔ ان کے پاس علّامہ مرحوم کے کلام کا ایک نایاب مجموعہ تھا۔
یہ صاحب بڑی دریادلی سے دوستوں کو اس مجموعہ سے استفادہ کا موقع دیا
کرتے تھے۔ دُوسرے صاحب مولوی عبدالرزّاق حیدرآبادی ہیں۔ ان کو
علّامہ کے کلام سے عشق تھا۔ عبدالرزّاق صاحب نے بعد میں اپنا مجموعہ "کُلّیاتِ
اقبال" کے نام سے شائع کر دیا۔ مَیں نے عبدالرزّاق صاحب کے مشورہ اور اُنکے
مرتّبہ کلّیات سے بھی پورا فائدہ اُٹھایا۔ جب مَیں سرینگر گیا تو وہاں منشی سراج الدین
مرحوم کی ضخیم بیاضوں میں علّامہ کی بہت سی غیر مطبوعہ نظمیں ملیں منشی صاحب کو
قدرت نے شعر و سخن کا عجیب ذوق عطا کیا تھا۔ وہ جب تک زندہ رہے
سری نگر اُن کی وجہ سے ایک ادبی مرکز بنا رہا۔ علّامہ مرحوم سے اُن کے نہایت

دوستانہ تعلقات تھے اور خط و کتابت رہتی تھی۔ علامہ ان کو اکثر اپنا کلام بھیجتے رہتے تھے۔ منشی صاحب ان خطوط کو جن میں علامہ کا کلام ہوتا تھا نہایت احتیاط سے بیاض میں چھپاں کر کے رکھ لیا کرتے تھے۔ عالی جناب دین محمد صاحب گورنر سندھ نے بھی میری رہنمائی فرمائی۔ دین محمد صاحب علامہ مرحوم کے دوستوں میں سے ہیں اور ان کو علامہ کا بیشتر کلام حفظ ہے۔ حیدر آباد دکن میں بعض احباب نے میری مدد فرمائی۔ اور جناب ڈاکٹر محی الدین صاحب زور کے نایاب کُتب خانہ سے بے حد مدد ملی۔ اس کتب خانہ میں اردو رسائل و جرائد کی مکمل جلدیں موجود ہیں ان سے بھی فائدہ اُٹھایا۔ غرض گذشتہ چالیس سال سے کلامِ اقبال کا جمع کرنا میرا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ اور اس کیلئے مَیں نے اکثر طویل سفر بھی اختیار کیے ؎

غبارِ راہ گشتم سُرمہ گشتم طوطیا گشتم

بچندیں رنگ گشتم تا بچشمت آشنا گشتم

میری ان ناچیز کوششوں کے نتیجہ میں میرے پاس علامہ کے اس کلام کا جو ان کی

کسی مطبوعہ کتاب میں شامل نہیں کافی ذخیرہ جمع ہو گیا۔ بعض احباب نے اس مجموعہ کی اشاعت کیلئے اصرار کیا۔ بعض نے اس وجہ سے اشاعت سے منع فرمایا کہ خود علاّمہ نے جس کلام کو اپنے کسی کلّیات میں شائع نہ کیا تھا اس کو کیوں شائع کیا جائے۔ غرض میں اسی کشمکش میں تھا کہ میری ملاقات لندن میں ۱۹۳۸ء میں شفیق محترم سر عبدالقادر مرحوم سے ہوئی۔ جب مَیں نے اپنے مجموعہ کا ذکر صاحب موصوف سے کیا تو اُنھوں نے نہایت شدّت سے اس مجمُوعہ کی اشاعت پر زور دیا۔ انڈیا آفس لندن میں بیٹھے ہوئے سر عبدالقادر نے بار بار فرمایا کہ علامہ نے کبھی غالب کی طرح اشاعت کے لئے اپنے کلام کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ بلکہ جب ان کو اپنے اردو کلام کی اشاعت کا خیال آیا تو علاّمہ نے اپنے احباب سے کلام جمع کر کے "بانگِ درا" کو مرتّب کیا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک صاحب عبدالغفور صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس بہُت نایاب ذخیرہ تھا۔ اس ذخیرہ سے علاّمہ کو بانگِ درا کی ترتیب میں بڑی مدد ملی۔ مگر اس کے باوجود علاّمہ مرحوم

کو اپنی بہت سی نظموں کا تو خیال بھی نہیں رہا تھا۔

سر عبدالقادر ۱۹۳۳ء میں حیدر آباد دکن تشریف لائے تو پھر اصرار کیا کہ میں اپنا مجموعہ جلد ایسی اپیل کے ساتھ شائع کردوں کہ جن اصحاب کے پاس علامہ کا دوسرا کلام محفوظ ہو وہ آئندہ اشاعت کے لیے ارسال کردیں۔ پھر جب کبھی صاحب موصوف کی خدمت میں لاہور حاضر ہونے کا موقع ملا تو اُنھوں نے ہمیشہ اس خواہش اشاعت کی بار بار تکرار کی۔ میری آرزو تھی کہ اس مجموعہ پر سر عبدالقادر ہی تقریظ تحریر فرمائیں، مگر یہ تمنا پوری نہ ہوسکی ع

اے بسا آرزو کہ خاک شُدہ

آج مرحوم کی آخری خواہش کے مطابق یہ مجموعہ عقیدتمندانِ اقبالؔ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ میرے لئے تو حضرت اقبالؔ کے متعلّق کوئی بھی تصنیف تالیف یا ترتیب سرمایۂ زندگی ہے ؎

عشق شور انگیز را ہر جادہ در کوئی تو برد　　　بر تلاش خود چہ می نازد کہ رہ سوئے تو برد

میں کسی حد تک مجموعے کی خامیوں سے واقف ہونے کے باعث اب تک
اس کی اشاعت میں پس و پیش کرتا رہا ہوں اور شاید اب بھی پس و پیش کرتا، مگر
اقبالؔ کے بے شمار شیدائیوں اور میرے کرم فرماؤں کے تقاضے حد سے بڑھنے لگے
ہیں، اور مزید برآں اس سلسلے میں جب مجھے سر عبد القادر مرحوم کے زبردست تقاضے
کا خیال آتا ہے تو مَیں سمجھتا ہوں کہ اس مجموعے کی اشاعت میں مزید تعویق قطعاً مناسب نہیں۔
ہر نظم کے متعلّق جو اس مجموعہ میں شامل ہے حتّی الوسع تحقیقات کر لی گئی ہے کہ
یہ نظم علّامہ مرحوم ہی کی ہے۔ پھر بھی اگر کسی صاحب کی رائے میں کوئی غلطی رہ گئی ہو، تو
ازراہِ کرم راقم الحروف کو مطلع فرمائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس مجموعہ میں کچھ ایسے اشعار شائع ہو
گئے ہوں جو علّامہ کے مطبوعہ کلام میں موجود ہوں اور اپنے حافظہ کی غلطی سے مَیں نے اِس
مجموعہ میں بھی ان کو شامل کر لیا ہو۔ اگر ناظرین کرام نے میری مدد کی تو قوی اُمید ہے کہ یہ
تمام خامیاں آئندہ اشاعت میں دور ہو جائیں گی۔ ناظرینِ کرام سے درخواست ہے کہ اگر
ان کے پاس علّامہ مرحوم کا ایسا کلام موجود ہو جو ابھی تک شائع نہیں ہُوا ہے تو اُس کو براہِ کرم

ارسال فرما دیں۔ تاکہ آئندہ اشاعت کے وقت اس کو بھی "باقیاتِ اقبالؔ" میں شامل کر لیا جائے۔ میری دلی خواہش ہے کہ اس نواپردازِ اسرارِ ازل کا ہر لفظ جو بقول مولانا سلیمان ندوی "گوشوارۂ حقیقت" ہے آئندہ نسلوں کیلئے محفوظ کر لیا جائے۔

موجودہ مجموعہ کی ترتیب میں دو باب 'متفرقات' اور 'ظریفانہ' تو علیحدہ قائم کر دئے گئے ہیں مگر دوسری نظموں کی ترتیب میں سوائے اسکے کہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ نظموں کو تاریخ وار درج کیا جائے کوئی اصول ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ جن نظموں کے سال تصنیف کا تعیّن ممکن تھا اس کا بھی تذکرہ کر دیا گیا ہے۔ الغرض راقم الحروف نے اس مجموعہ کو عقیدتمندانِ اقبالؒ کے لئے دلچسپ بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے اگر تائیدِ ایزدی شامل حال رہی تو یہ کوشش برابر جاری رہے گی۔ السعی منّی والاتمام من اللہ۔

یکم جنوری ۱۹۵۲ء — سیّد عبدالواحد

نمبر ۱۰، کچہری روڈ۔ کراچی — معتمد مجلسِ اقبالؒ

تقریظ مولانا عبدالحق

انجمن ترقی اردو پاکستان۔ اسپتال روڈ۔ کراچی ۱، نمبر فون: ۲۷۸۴

مؤرخہ ۲۷ر دسمبر ۱۹۵۱ء

عبدالواحد صاحب نے کمال کیا ہے کہ علامہ اقبال کا غیر مطبوعہ کلام ایک جا جمع کر کے شائع کر دیا۔ اس کی تلاش میں وہ کہاں کہاں پھرے ہیں۔ اور ایسے ایسے نامعلوم گوشوں، بھولی بسری صحبتوں اور گمنام بیاضوں تک پہنچ کر جہاں رسائی دشوار تھی، یہ جواہرات جمع کئے ہیں۔

مرزا غالب نے اپنے کلام کا انتخاب شائع کیا تھا اور یہ لکھ دیا تھا کہ اس کے سوا کوئی میرا کلام پیش کرے تو ہرگز میرا کلام نہ سمجھا جائے۔ مگر باوجود اس کے اُن کے پرستاروں نے ان کا ایک ایک رُقعہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور شائع کیا۔ اس تلاش میں وُہ نسخہ بھی دستیاب ہوُا جو مرزا نے تحفتاً بھوپال کے فوجدار خاں

کو پیش کیا تھا اور جو نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہؤا اس میں بعض ایسے نایاب اور بلند پایہ شعر نکلے جو انتخاب کے وقت مرزا کی نظر سے اوجھل تھے۔ یا حافظے سے جاتے رہے تھے اور اس لئے مطبوعہ کلام میں شامل ہونے سے رہ گئے۔

یہی صورت اب اس کلام کی ہے جو عبدالواحد صاحب نے جمع کیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ علامۂ ممدوح کے سامنے ہوتا تو اس میں کا کس قدر حصّہ وہ خود شائع کرتے۔ اس کلام کے جمع اور شائع کرنے کی سعادت عبدالواحد صاحب کی قسمت میں تھی۔ یہ اُنھوں نے ایسا نادر اور یادگار کام کیا ہے جس کے لئے وہ قابلِ مبارکباد اور مستحقِ شکریہ ہیں۔ خاص کر کلامِ اقبالؔ کے قدردانوں کو ان کا تہ دل سے شکر گذار ہونا چاہیئے۔

عبدالحق

دیباچہ طبع دوم

باقیاتِ اقبال کا پہلا ایڈیشن بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے مشورے اور سرعبدالقادر مغفور کے اصرار پر ۱۹۵۲ء میں شائع کیا گیا تھا۔ اس کی ترتیب میں برسوں کی محنّت اور تجسّس کارفرما تھی۔ پھر بھی مجموعہ کی طباعت کے دوران میں یہ محسوس ہو گیا تھا کہ اس کے علاوہ بھی علاّمہ کے ایسے کلام کا کافی ذخیرہ متعلّقین اقبال کی بیاضوں میں یا پُرانے رسالوں میں موجود ہے جو اقبال کے کسی شائع شدہ مجموعے میں شامل نہیں۔ طباعت کے دوران جو کلام دستیاب ہوا اس کو بطورِ ضمیمہ شامل کر لیا تھا۔ مگر باقیات کی اشاعت کے بعد بھی تجسّس جاری رہی۔ اور اس کے نتیجہ میں ایسا بہت سا کلام جمع ہو گیا۔

خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں راقم الحروف کی ملاقات شفیق محترم جناب محمّد عبداللہ قریشی سے ہوئی۔ صاحب موصوف کو اقبالیات کے ہر شعبہ سے ایک والہانہ شغف ہے۔ ان کو اقبالیات کے سلسلہ میں دوسری دلچسپیوں کے علاوہ علاّمہ کے کلام جمع کرنے کا بھی شوق ہے۔ انھوں نے نہایت دریا دِلی سے اپنی برسوں کی محنت سے جمع کیا ہوا کلام باقیات میں شامل کرنے کے لئے نذر کر دیا۔ یہی نہیں۔ صاحب موصوف نے باقیات کی ترتیب نو میں اس قدر دلچسپی لی کہ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ باقیات کا موجودہ ایڈیشن ان ہی کی مساعی جمیلہ کا مرہونِ احسان ہے۔ در اصل صاحب

موصوف نے باقیات کے اس ایڈیشن کو دلچسپ بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ علامہ کا غیر مطبوعہ کلام جمع کرنے کے لئے جناب عبداللہ قریشی اور راقم کی کوششیں بدستور جاری رہیں گی۔ قارئین بھی اس کام میں حتی الوسع ہماری مدد فرمائیں ہماری خواہش یہ ہے کہ علامہ مرحوم کی فکرِ سخن کا ہر دُرِ شاہوار آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ ہو جائے۔

جن اصحاب نے باقیات کی ترتیب کے سلسلہ میں اپنے بیش بہا مشوروں سے مستفیض فرمایا ہے اُن کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی یہ اصحاب اس سلسلہ میں اپنی دلچسپی جاری رکھیں گے۔

سید عبدالواحد

فہرست

متروکاتِ بانگِ درا

غزلیات

شمار	عنوان	صفحہ

نظمیں

فلاحِ قوم

اقبالؔ نے یہ نظم فروری ۱۸۹۶ء میں انجمن کشمیری مُسلمانانِ لاہور کے ایک اجلاس میں پڑھی تھی۔ اور ان کی نظرِ ثانی کے بعد مارچ ۱۹۰۹ء کے کشمیری میگزین میں شائع ہوئی تھی :-

کیا تھا گردشِ ایّام نے مُجھے محزُوں
بدن میں جان تھی جیسے قفس میں صیدِ زبُوں

چڑھائی فوجِ الم کی ہوئی تھی کچھ ایسی
عَلَم خوشی کا مرے دِل میں ہوگیا تھا نگُوں

کیا تھا کُوچ جو دل سے خوشی کی فوجوں نے
لگائے خیمہ تھے واں رنج کے جنود و قشُوں

غم و الم نے جگر میں لگا رکھی تھی اِک آگ

بنا ہُوا تھا مرا سینہ رشکِ صد کانوں

زبسکہ غم سے پریشاں کیا ہُوا تھا مجھے

یہ فکر بسکہ لگی تھی کہ ہو نہ جائے جنوں

جو سامنے تھی مرے قوم کی بُری حالت

اُمڈ گیا میری آنکھوں سے خُون کا سیحوں

انہی غموں میں مگر مجھ کو اک صدا آئی

کہ بیت قوم کی اصلاح سے ہُوئی موزوں

پئے مریض یہ اک نُسخۂ مسیحا تھا

کہ جس کو سُن کے ہُوا خرّمی سے دل مشحوں

غُبارِ دِل میں جو تھا کُچھ فلک کی جانب سے

دبے اسی میں غم و رنج صورتِ قارُوں

ہزار شُکر کہ اِک انجمن ہُوئی قائم

یقیں ہے راہ پہ آئے گا طالِع واژوں

ملے گا منزلِ مقصود کا پتہ ہم کو

خدا کا شکر ہے جس نے دیئیے یہ راہ نموں

ہلال وار اگر مُنہ میں دو زبانیں ہوں

ادا نہ پھر بھی ہو شُکرِ خُدائے کُن فیکوں

مثالِ شانہ اگر میری سَو زبانیں ہوں

نہ طے ہو زُلف رہِ شکر ایزدِ بے چُوں

چلی نسیم یہ کیسی کہ پڑ گئی ٹھنڈک

چمن ہُوئی مرے سینے میں نارِ سوزِ درُوں

یہ کیا خوشی ہے کہ دِل خود بخود یہ کہتا ہے

بعید رنج سے اور خرّمی سے ہُوں مقروں

خوشی سے آ کے خُدا جانے کیا کہا اُس نے

اُچھل رہا ہے مثالِ تموّجِ جیحوں

کرم سے اس کے وُہ صورت فلاح کی نکلی

کہ حصنِ قوم ہر اک شر سے ہو گیا ہے مصوں

خُدا نے ہوش دیا متّفق ہوئے سارے

سمجھ گئے ہیں تری چال گنبدِ گردُوں

چراغِ عقل کو روشن کیا ہے ظُلمت میں

ہمارے ہاتھ میں آ جائے گا دُرِ مکنوں

مزا تو جب ہے کہ ہم خود دکھائیں کُچھ کر کے

جو مرد ہے نہیں ہوتا ہے غیر کا ممنوں

بڑھے یہ بزم ترقّی کی دوڑ میں یارب

کبھی نہ ہو قدمِ تیز آشنائے سکوں

اسی سے ساری اُمیدیں بندھی ہیں اپنی کہ ہے

وجود اس کا پئے قصرِ قوم مثلِ ستُوں

دُعا یہ تجُھ سے ہے یارب کہ تا قیامت ہو

ہماری قوم کا ہر فرد قوم پر مفتوں

جو دوڑ کے لئے میدانِ علم میں جائیں

سبھوں سے بڑھ کے رہے ان کے فہم کا گُلگُوں

کچُھ ان میں شوق ترقّی کا حد سے بڑھ جائے

ہماری قوم پہ یارب وُہ پھُونک دے افسوں

دِکھائیں فہم و ذکاء و ہُنر یہ اوروں کو

زمانے بھر کے یہ حاصل کریں، علوم و فنوں

جو تیری قوم کا دُشمن ہو اس زمانے میں

اسے بھی باندھ لے اقبالؔ! صُورتِ مضمون

رُباعیات

مندرجہ ذیل رُباعیاں بھی اقبالؔ نے انجمن کشمیری مسلماناں کے ایک اجلاس میں پڑھیں۔ اور بعد میں کشمیری گزٹ بابت ماہِ ستمبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئیں :-

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر
چشمِ اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
درِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں
مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر

کہکشاں میں آ کے اختر مل گئے
اک لڑی میں آ کے گوہر مل گئے
واہ وا کیا محفلِ احباب ہے
ہم وطن غربت میں آ کر مل گئے

موتی عدن سے لعل ہُوا ہے یمن سے دُور
یا نافۂ غزال ہُوا ہے ختن سے دُور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بُلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دُور

سامنے ایسے گلستاں کے کبھی گر نکلے
جیبِ خجلت سے سرِ طور نہ باہر نکلے
ہے جو ہر لحظہ تجلّی گہِ مولائے جلیل
عرش و کشمیر کے اعداد برابر نکلے

پنجۂ ظلم و جہالت نے بُرا حال کیا
بن کے مقراض ہمیں بے پر و بے بال کیا
توڑ اس دستِ جفاکیش کو یا رب جس نے
رُوحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

بُت پرستی کو مرے پیشِ نظر لاتی ہے
یادِ ایّامِ گزشتہ مجھے شرماتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکہ اقبال
کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

نالۂ یتیم

یہ درد انگیز نظم علاّمہ مرحوم نے انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے پندرھویں سالانہ جلسہ میں (۲۴ر فروری سن ۱۹۰۰ء کو بعد نماز عصر) پڑھی تھی شمس العلمأ مولانا نذیر احمد اس اجلاس کے صدر تھے۔ جنھوں نے فرمایا "میں نے دبیر اور انیس کی بہت سی نظمیں سنی ہیں مگر واقعی ایسی دلخراش نظم کبھی نہیں سنی"[۱]

آہ! کیا کہیے کہ اب پہلو میں اپنا دِل نہیں

بجھ گئی جب شمعِ روشن درخورِ محفل نہیں

اے مصافِ نظمِ ہستی میں ترے قابل نہیں

نا اُمیدی جس کو طے کرلے یہ وُہ منزل نہیں

ہائے کس مُنہ سے شریکِ بزمِ میخانہ ہُوں میں

ٹکڑے ٹکڑے جس کے ہوجائیں وُہ پیمانہ ہُوں میں

۱؎ روئداد ص۳۶ ،

خارِ حسرت غیرتِ نوک سناں ہونے لگا

یوسفِ غم زینتِ بازار جاں ہونے لگا

دل مرا شرمندۂ ضبطِ فغاں ہونے لگا

نالۂ دل رُوشناسِ آسماں ہونے لگا

کیوں نہ وُہ نغمہ سرائے رشکِ صد فریاد ہو

جو سرودِ عندلیبِ گُلشن برباد ہو

پنجۂ وحشت بڑھا چاکِ گریباں کیلئے

اشکِ غم ڈھلنے لگے پا بوس داماں کے لئے

مُضطرب ہے یُوں دلِ نالاں بیاباں کیلئے

جس طرح بُلبل تڑپتا ہے گلستاں کے لئے

لیں گے ہم ہنگامۂ ہستی میں اب کیا بیٹھ کر

روئیے جاکر کسی صحرا میں تنہا بیٹھ کر

قابلِ عشرت دلِ خوکردۂ حسرت نہیں

دہرِ غور بزمِ طرب شمعِ سرِ تُربت نہیں

زیرِ گردوں شاہدِ آرام کی صُورت نہیں

غیرِ حسرت غازۂ رخسارۂ راحت نہیں

صبحِ عشرت بھی ہماری غیرتِ صد شام ہے

ہستیٔ انساں غبارِ خاطرِ آرام ہے

ہے قیامِ بحرِ ہستی جزر و مدّ اسلام کا

گاہے گاہے آنکلتی ہے مسرّت کی ہوا

زندگی کو نورِ اُلفت سے ملی جس دم ضیا

لے کے طُوفانِ ستم ابرِ تغیّر آگیا

ہے کسی کو کامِ دل حاصل کوئی ناکام ہے

اس نظارہ کا مگر خاکِ لحد انجام ہے

اے فلک تُجھ سے تمنّائے سعادت پروری
ہر ستارا ہے ترا داغِ دلِ نیک اختری
تُو نے رکھّا ہے کسے حرماں نصیبی سے بری؟
اے مُسلماناں فغاں از دورِ چرخِ چنبری
دوستی از کس نمے بینیم یاراں راچہ شُد
دوستی کو آخر آمد دوستداراں راچہ شُد
نُطق کر سکتا نہیں کیفیّتِ غم کو عیاں
اس کی تیزی کو مٹا دیتے ہیں اندازِ بیاں
آنہیں سکتی زباں تک رنج و غم کی داستاں
خندہ زن میرے لبِ گویا پہ ہے دردِ نہاں
عجزِ گویائی ہے گویا حکمِ قیدِ خامشی
مُجرمِ اظہارِ غم کو یہ سزا ملنے لگی

زخمِ دل کے واسطے ملتا نہیں مرہم مجھے

اپنی قسمت کا ہے رونا صورتِ آدم مجھے

ظلِّ دامانِ پدر کا ہے زبس ماتم مجھے

ہاں ڈبو دے اے محیطِ دیدۂ پُرنم مجھے

مضطرب اے دِل نہ ہونا ذوقِ طفلی کے لئے

تو بنا ہے تلخئ اشکِ یتیمی کے لئے

سایۂ رحمت ہے تُو اے ظلِّ دامانِ پدر

غنچۂ طفلی پہ ہے مثلِ صبا تیرا گذر

رہنما ہے وادئ عالم میں تو مثلِ خضر

تُو تو ہے اک مظہرِ شانِ کریمی سربسر

ہے شہنشاہی جو طفلی تو ہما تاثیر ہے

تو نہ ہو تو زندگی اک قیدِ بے زنجیر ہے

عین طفلی میں ہلال آسا کمر خم کھا گئی
صُبحِ پیری کی مگر بن کر یتیمی آ گئی
یادِ ناکامی اسے کیا جانے کیا سمجھا گئی
شعلۂ سوزِ الم کو اَور بھی بھڑکا گئی

دم کے بدلے میرے سینے میں دمِ شمشیر ہے
زندگی اپنی کتابِ موت کی تفسیر ہے

جوششِ صرصر سے ہے اَے بحر جولانی تری
اور قمر کے دم سے ہے ساری یہ طُغیانی تری
کوہ و دریا سے ہے قائم شانِ سُلطانی تری
اور شعاعِ مہر سے ہے خندہ پیشانی تری

نظمِ عالم میں نہیں موجود سازِ بے کسی
ہو گئی پھر کیوں یتیمی صیدِ بازِ بے کسی

کھینچ سکتا ہے مصوّر خندۂ گُل کا سماں
اور کچھ مشکل نہیں اے برق تیری شوخیاں
صبح کا اختر نہیں کلکِ تصوّر پر گراں
اَوْر ہی کچھ ہیں مگر میرے تبسّم کے نشاں
یہ تبسّم اشکِ حسرت کا نمک پروردہ ہے
دردِ پنہاں کو چھُپانے کیلئے اک پردہ ہے
یادِ ایّامِ سلف تو نے مجھے تڑپا دیا
آہ اے چشمِ تصوّر تُو نے کیا دِکھلا دیا
اے فراقِ رفتگاں یہ تو نے کیا دِکھلا دیا
دردِ پنہاں کی خلش کو اَور بھی چمکا دِیا
رہ گیا ہوں دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر
کچھ مداوا اِس مرض کا اے دلِ ناکام کر

آمدِ بُوئے نسیمِ گُلشنِ رشکِ ارم

ہو نہ مرہونِ سماعت جس کی آوازِ قدم

لذّتِ رقصِ شعاعِ آفتابِ صُبحدم

یا صدائے نغمۂ مُرغِ سحر کا زیر و بم

رنگ کچھ شہرِ خموشاں میں جما سکتی نہیں

خفتگانِ کنجِ مرقد کو جگا سکتی نہیں

ہر گھڑی اے دل نہ یُوں اشکوں کا دریا چاہیئے

داستاں جیسی ہو ویسا سننے والا چاہیئے

ہر کسی کے پاس یہ دُکھڑا نہ رونا چاہیئے

آستاں اس کو یتیمِ ہاشمی کا چاہیئے

چشمِ باطن کی نظر بھی کیا سبک رفتار ہے

سامنے اک دم میں درگاہِ شہِ ابرار ہے

اے مددگارِ غریباں اے پناہِ بے کساں

اے نصیرِ عاجزاں اے مایۂ بے مائگاں

کارواں صبر و تحمّل کا ہوُا دل سے رواں

کہنے آیا ہُوں مَیں اپنے درد و غم کی داستاں

ہے تری ذاتِ مُبارک حلِّ مشکل کے لیۓ

نام ہے تیرا شفا دُکھّے ہوئے دِل کیلئے

بیکسوں میں تاب جورِ آسماں ہوتی نہیں

اِن دلوں میں طاقتِ ضبطِ فغاں ہوتی نہیں

کون وُہ آفت ہے جو رہینِ بیاں ہوتی نہیں

اک یتیمی ہے کہ ممنونِ زباں ہوتی نھیں

میری صُورت ہی کہانی ہے دلِ ناشاد کی

ہے خموشی بھی مری سائل تری امداد کی

بزمِ عالم میں طرازِ مسندِ عظمت ہے تو

بہرِ انساں جبرئیل آیۂ رحمت ہے تُو

اے دیارِ علم و حکمت قبلۂ اُمّت ہے تو

اے ضیائے چشمِ ایماں زیبِ ہر مدحت ہے تُو

درد جو انساں کا تھا وُہ تیرے پہلو سے اُٹھا

قُلزمِ جوشِ محبت تیرے آنسو سے اُٹھا

آبِ کوثر تشنہ کامانِ محبّت کا ہے تُو

جس کے ہر قطرے میں سَو موتی ہوں وُہ دریا ہے تُو

طُورِ پر چشمِ کلیم اللہ کا تارا ہے تُو

معنیٔ یٰسیٓن ہے تُو مفہومِ اَوْ اَدْنیٰ ہے تُو

اس نے پہچانا نہ تیری ذاتِ پُر انوار کو

جو نہ سمجھا احمدِ بے میم کے اسرار کو

دلربائی میں مثالِ خندۂ مادر ہے تُو

مثلِ آوازِ پدر شیریں تر از کوثر ہے تُو

جس سے تاجِ عرش کو زینت ہو وُہ گوہر ہے تُو

از پئے تقدیرِ عالم صُورتِ اختر ہے تُو

زیبِ حسنِ محفلِ اشرافِ عالم تُو ہُوا

تھی مؤخّر گرچہ آمد پر مقدّم تُو ہُوا

تیرا رُتبہ جوہرِ آئینۂ لولاک ہے

فیض سے تیرے رگِ تاکِ یقیں نمناک ہے

تیرے سایہ سے منوّر دیدۂ افلاک ہے

کیمیا کہتے ہیں جس کو تیرے در کی خاک ہے

تیرے نظّارے کا مُوسیٰ میں کہاں مقدور ہے

تو ظہورِ لَن ترَانی گوئے اوجِ طُور ہے

دوپہر کی آگ میں وقتِ درودِ دہقان پر

ہے پسینے سے نمایاں مہرِ تاباں کا اثر
جھلکیاں اُمّید کی آتی ہیں چہرے پر نظر
کاٹ لیتا ہے مگر جس وقت محنت کا ثمر
یا محمدؐ کہہ کے اُٹھتا ہے وُہ اپنے کام سے
ہائے کیا تسکیں اُسے ملتی ہے تیرے نام سے

وُہ پناہِ دینِ حق وہ دامنِ غارِ حرا
جو ترے فیضِ قدم سے غیرتِ سینا ہُوا
وُہ حصارِ عافیت وُہ سلسلہ فاران کا
جس کے ہر ذرّہ سے اُٹھی دینِ کامل کی صدا
فخرِ پابوسی سے تیری آسماں سا ہو گئی
یہ زمیں ہم پایۂ عرشِ معلّےٰ ہو گئی

نظمِ قُدرت میں نشاں پیدا نہیں بیداد کا
شکوہ کرنا کام ہوتا ہے دلِ ناشاد کا

آ گرا ہُوں تیرے در پر وقت ہے امداد کا
سرفرازی چاہیئے بدلہ مری اُفتاد کا

آ نہ سکتا تھا زباں تک بے کسی کا ماجرا
حوصلہ لیکن مجھے تیری یتیمی نے دیا

تھم ذرا بے تابیٔ دل کیا صدا آتی ہے یہ
لُطفِ آبِ چشمۂ حیواں کو شرماتی ہے یہ

دل کو سوزِ عشق کی آتش سے گرماتی ہے یہ
رُوح کو یادِ الٰہی کی طرح بھاتی ہے یہ

ہاں ادب اے دل بڑھا اعزازِ مُشتِ خاک کا
مَیں مخاطب ہُوں جنابِ سیّدِ لولاکؐ کا

اے گرفتارِ یتیمی اے اسیرِ قیدِ غم!

تجھ سے ہے آرامِ جانِ سیّدِ خیر الاُمم

نا اُمیدی نے کئے ہیں تجھ پہ کچھ ایسے ستم

چھیڑتا ہے دل کو تیرا نالۂ درد و الم

تیری بے سامانیوں سے کیوں نہ میرا دِل جلے

شرم سی آتی ہے تجھ کو بے نوا کہتے ہوئے

خرمنِ جاں کے لئے بجلی ترا افسانہ ہے

دل نہیں پہلو میں، تیرے غم کا عشرت خانہ ہے

جس پہ بربادی ہو صدقے وُہ ترا ویرانہ ہے

سہم جائے جس سے فرحت وُہ ترا کاشانہ ہے

کانپتا ہے آسماں تیرے دلِ ناشاد سے

ہل گیا عرشِ معظّم بھی تری فریاد سے

خُون رلواتا ہے تیرا دیدۂ گریاں مُجھے
کیوں نظر آتا ہے تو رہنِ غمِ پنہاں مجھے
کیوں نظر آتا ہے تیرا حال بے ساماں مُجھے
کیوں نظر آتا ہے تُو مثلِ تنِ بے جاں مجھے
میری اُمّت کیا شریکِ دردِ پیغمبر نہیں
کیا جہاں میں عاشقانِ شافعِ محشر نہیں
جس طرح مجُھ سے نبوّت میں کوئی بڑھ کر نہیں
میری امّت سے حمیّت میں کوئی بڑھ کر نہیں
امتحانِ صدق و ہمّت میں کوئی بڑھ کر نہیں
اِن مسلمانوں سے غیرت میں کوئی بڑھ کر نہیں
یہ دل و جاں سے خُدا کے نام پر قرباں ہیں
ہوں فرشتے بھی فدا جن پر یہ وُہ انساں ہیں

جا کے یُوں کہنا کہ "اے گُلہائے باغِ مصطفےٰؐ

تُم سے برگشتہ نہ ہو جائے زمانے کی ہَوا

عرصۂ ہستی میں از بہرِ حصُولِ مُدّعا

رشکِ صد اکسیر ہوتی ہے یتیموں کی دُعا

یہ وُہ جادو ہے کہ جس سے دیوِ حرماں دُور ہو

یہ وُہ نسخہ ہے کہ جس سے دردِ عصیاں دُور ہو

یہ دُعا میدانِ محشر میں بڑی کام آئے گی

شاہدِ شانِ کریمی سے گلے ملوائے گی

آتشِ عشقِ الٰہی سے تُمھیں گرمائے گی

جو نہ موسیٰؑ نے بھی دیکھا تھا تمھیں دکھلائے گی

جس طرح مجھ کو شہیدِ کربلا سے پیار ہے

حق تعالیٰ کو یتیموں کی دُعا سے پیار ہے

جوش میں اپنی رگِ ہمّت کو لانا چاہیئے

احمدی غیرت زمانے کو دکھانا چاہیئے

بندشِ غم سے یتیموں کو چھڑانا چاہیئے

مِل کے اک دریا سخاوت کا بہانا چاہیئے

کام بے دولت تہِ چرخِ کُہن چلتا نہیں

نخلِ مقصد غیر آبِ زر کہیں پھلتا نہیں

صیدِ شاہینِ یتیمی کا پھڑکنا اَور ہے

نوک جس کی دل میں چُبھتی ہو وُہ کانٹا اَور ہے

علّتِ حرماں نصیبی کا مداوا اَور ہے

دردِ آزارِ مصیبت کا مسیحا اور ہے

پھُونک دیتا ہے جگر کو دل کو تڑپاتا ہے یہ

نسخۂ مہر و محبّت سے مگر جاتا ہے یہ

تھی یتیمی کچھ ازل سے آشنا اسلام کی

پہلے رکھّی ہے یتیموں نے بنا اسلام کی

کہہ رہی ہے اہلِ دل سے ابتدا اسلام کی

ہے یتیموں پر عنایت انتہا اسلام کی

تم اگر سمجھو تو یہ سَو بات کی اِک بات ہے

آبرُو میری یتیمی کی تُمھارے ہات ہے

خدا حافظ

منشی محبوب عالم کے یورپ روانہ ہونے پر

یہ نظم منشی محبوب عالم مالک پیسہ اخبار لاہور کے سفر یورپ پر تشریف لے جانے کے موقعہ پر وداعی جلسہ منعقدہ ۲۵ رمئی سنہ ۱۹۰۰ء کو جمعہ کے روز اسلامیہ کالج کے صحن میں پڑھی گئی اور ان کے سفر نامے میں شائع ہوئی۔

لیجے حاضر ہے مطلعِ رنگیں
جس پہ صدقے ہو شاہدِ تحسیں

سوئے یورپ ہوئے وہ راہ سپر ۔۔۔ مفت میں ہو گیا ستم ہم پر
آنکھ اپنی ہے اشکِ خونیں سے ۔۔۔ غیرتِ کاسۂ مےِ احمر
فتح ملکِ ہنر کو جاتے ہیں ۔۔۔ ہم رکابی کو آرہی ہے ظفر

تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے — کھینچ کر لے چلا ہے ذوقِ نظر

فخرِ انساں کا ہے تلاشِ کمال — جستجو چاہیے مثالِ قمر

خوب تاڑا ہے سیر کا موقع — نکتہ بیں چاہیے نگاہِ بشر

سیرِ دریا میں ہیں ہزار مزے — جس کو دکھلائے خالقِ اکبر

وہ سرِ شام بحر کی موجیں — مہر کا وہ خرام پانی پر

اور وہ چاندنی کہ بحر جیسے — اوڑھ لیتا ہے صورتِ چادر

دی خبر آپ نے یہ کیا ناگاہ — چپکے چپکے چبھو دیا نشتر

دوستوں کا فراق قاتل ہے — درد اٹھا ہے صورتِ محشر

آنکھ میں ہیں، نہیں رواں لیکن — اشک اپنے ہیں مثلِ آبِ گہر

جائیے اور پھر کے آئیے گا — صورتِ بوئے نافۂ اذفر

اس طرح راہ آنکھ دیکھے گی — جوں مؤذن کو انتظارِ سحر

بزمِ یاراں رہے گی یوں خاموش — جیسے چپ چاپ شام کو ہوں شجر

سرِ مژگاں پہ آ گئے آنسو　　نکل آیا جو دِل میں تھا مضمر

مدحِ احباب فرضِ انساں ہے　　لاؤں اس کے لئے مَیں خامۂ زر

یاں خموشی گناہ ہے ایسی　　جس طرح کفر ہجوِ پیغمبر

یہ سفر آپ کو مُبارک ہو

یہ حضر آپ کو مُبارک ہو

آپ ہیں محوِ سیرِ دریائی　　چشمِ احباب غم سے بھر آئی

رقص موجوں کا جا کے دیکھیں گے　　بھیج دی ہے جہاز کو سائی

لُطف اخبار کا جب آتا ہے　　بزمِ یورپ سے ہو شناسائی

دمِ رُخصت وُہ گرم جوشی ہے　　آتشِ عشق جس سے شرمائی

کسی کونے میں تاکتی ہے اسے　　گرمئ آفتاب جولائی

لب سے نکلا کہ فی امان اللہ　　فخر کرتی ہے تابِ گویائی

نشۂ دوستی چڑھا ایسا　　شعر میں بھی ہے رنگِ صہبائی

آب آئینہ پر گراتے ہیں ‌‌ ‌ ‌ "بملامت روی و باز آئی"

عزمِ پنجاب ہو مگر جلدی ‌ ‌ ‌ ‌ کہ نہیں طاقتِ شکیبائی

ہو نہ محبوب سے جدا کوئی ‌ ‌ ‌ ‌ اے رگِ جانِ عالم آرائی[1]

الغیاث ! اے معلّمِ ثالث[2] ‌ ‌ ‌ ‌ دردِ فرقت سے جان گھبرائی

ایسی پڑیا کوئی عنایت ہو ‌ ‌ ‌ ‌ دل سے اُٹھے کہ وہ شفا پائی

آگیا بحر چپ رہو اقبال ‌ ‌ ‌ ‌ خامہ کرتا ہے عذرِ بے پائی

توبہ کر لی ہے شعر گوئی سے ‌ ‌ ‌ ‌ اس کی قیمت پڑی نہ اک پائی

شعر سے بھاگتا ہوں مَیں کوسوں ‌ ‌ ‌ ‌ ہے یہ توحید اور مَیں عیسائی

"آں چہ دانا کند کند ناداں ‌ ‌ ‌ ‌ لیک بعد از ہزار رسوائی"

دوستوں کی رہے دعا حافظ

ہو سفر میں ترا خدا حافظ

---

[1] مولوی محبوب عالم۔ [2] مشہور فلسفی اور طبیب بوعلی سینا۔

یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے

یہ نظم اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سولھویں
سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۰۱ء میں پڑھی تھی۔

بندِ اوّل

اے مہِ عید بے حجاب ہے تُو — حُسنِ خورشید کا جواب ہے تو
اے گریبانِ جامۂ شبِ عید — شاہدِ عیش کا شباب ہے تو
اے نشانِ رکوعِ سُورۂ نُور — نقشۂ کلکِ انتخاب ہے تُو
اے جوابِ خطِ جبینِ نیاز — طاعتِ صوم کا ثواب ہے تو
ہائے اے حلقۂ پرِ طاؤس — قابلِ ذٰلِكَ الكتاب ہے تو
فوجِ اسلام کا نشاں تُو ہے — چشمِ نصرت کا انتخاب ہے تو

چشمِ طفلی نے جب تجھے دیکھا — کہہ دیا خواب کو کہ خواب ہے تُو
طوفِ منزل گہِ زمیں کے لئے — ہمہ تن پائے در رکاب ہے تُو
یہ اُبھرتے ہی آنکھ سے چھُپنا — روشنی کا مگر حباب ہے تو

تو کمندِ غزالِ شادی ہے
لذّت افزائے شورِ طفلی ہے

بند دوم

مقصدِ دیدۂ اُمید ہے کل — گوہرِ عیش کی خرید ہے کل
دیدۂ مہرِ عالم آرا میں — سرمۂ عید کی کشید ہے کل
گلشنِ نو بہارِ ہستی میں — سبزۂ عیش کی دمید ہے کل
کحلِ محرابِ ہر جبینِ نیاز — زینت افزائے عینِ عید ہے کل
اے مہِ نو ترا پیامِ طرب — ہے شنید آج چشم دید ہے کل
اے نسیمِ نشاطِ رُوحانی — باغِ دل میں تری وزید ہے کل

ہے یہی نغمۂ لبِ طفلی ہاتھ لانا ادھر کہ عید ہے کل
کمسنوں کو یہ کہہ رہا ہے ہلال لو میاں شب بخیر عید ہے کل
سر بالیں لباسِ طفلی ہے میری عُریاں تنی کی عید ہے کل

اے مہِ نو خوشی ہو کیا جی کو
تیرے آنے سے کیا یتیمی کو

بند سوم

جھُوٹ ہے عید کا ہلال ہے تو ساغرِ بادۂ ملال ہے تو
کہہ سُنا قصّۂ ستم زدگاں کہ ہمارا لبِ مقال ہے تو
ہستیٔ سوز ہے نظارا ترا غازۂ عارضِ مقال ہے تو
اے گدائے شارعِ پرتوِ مہر ہمہ تن کاسۂ سوال ہے تو
چشمۂ مہر پر نظر ہے تری تشنہ کامِ مےِ کمال ہے تو
یہ دکھاوا ہے سب تلاشِ کمال یا بہ منزل گہِ زوال ہے تو

ہائے شاید خبر نہیں تجھ کو | اپنی امید کا مآل ہے تُو
بڑھ گیا خم مرے مقدّر کا | کیوں نہ کہہ دیں کہ بیمثال ہے تُو
میرے شوقِ لباسِ نو کے لئے | سبق آموزِ انفعال ہے تُو

کیا بتاؤں تجھے کہ کیا ہُوں مَیں
تجھ کو حسرت سے دیکھتا ہُوں مَیں

بندِ چہارم

ستمِ گوشِ باغباں ہوں مَیں | خبرِ آمدِ خزاں ہُوں مَیں
شرمسارِ متاعِ ہستی ہوں | مایۂ نازشِ زیاں ہُوں مَیں
مجھ سے شرما گیا تبسّم بھی | کہ سراپا لبِ فغاں ہُوں مَیں
بار ہُوں طاقتِ شنیدن پر | کس مصیبت کی داستاں ہوں میں
آہ منزل نہیں نصیبوں میں | موجۂ گردِ کارواں ہُوں مَیں
اپنی بے مائیگی پہ نازاں ہوں | مفت جاتا ہُوں کیا گراں ہوں میں

اے فلک خوانِ زندگی پہ مگر — کوئی ناخواندہ میہماں ہوں میں
ستمِ ناروا سے مرتا ہوں — آسماں کا مزاج داں ہوں میں
آرزو یاس کو یہ کہتی ہے — اک مٹے شہر کا نشاں ہوں میں
ایسی قسمت کسی کی ہوتی ہے
آہ میری اثر کو روتی ہے

بندِ پنجم

بن کے نشتر چبھا ہے تو دل میں — آرزو ہو گئی لہو دل میں
چاکِ دل پر نثار ہوتی ہے — حسرتِ سوزنِ رفو دل میں
یاس نقشہ جمائے جاتی ہے — چھپتی پھرتی ہے آرزو دل میں
درد تیزی سے بڑھ گیا اے غم — کیا رہی تیری آبرو دل میں
دو گھڑی بیٹھنے نہیں دیتی — ہے کوئی چیز فتنہ خو دل میں
گرہِ رشتۂ حیات نہ ہو — یہ جو ہوتی ہے آرزو دل میں

دیکھ اے یاس اب تلک باقی
خونِ اُمید کی ہے بُو دِل میں

عُمر تیری بڑی ہے یادِ پدر
تھی ابھی تیری گفتگو دل میں

اے خیالِ مسرّتِ طفلی
آگیا ہے کدھر سے تُو دِل میں

دردِ دِل کا بھی کیا فسانہ ہے
خون رونے کا اِک بہانہ ہے

بندِ ششم

مصرِ ہستی میں شام آتی ہے
رنگ اپنا جمائے جاتی ہے

اے سبُوئے مئے شفق اے شام
تُو مئے بے خودی پلاتی ہے

سُرمۂ دیدۂ اُفق بن کر
چشمِ ہستی میں تو سماتی ہے

کس خموشی سے اُڑ رہے ہیں طیور
تو رہِ آشیاں دِکھاتی ہے

ریزشِ دانہائے اختر کو
مزرعِ آسماں میں آتی ہے

تُو پرِ طیرِ آشیاں رَو کو
چشمِ صیّاد سے چھُپاتی ہے

صُبح در آستیں ہے تُو شاید　　آنکھ اختر کی کھُلتی جاتی ہے

تو پیام وفاتِ بیداری　　محفلِ زندگی میں لاتی ہے

اپنے دامن میں بھر کے غنچہ و گُل　　خواب لے کر چمن میں آتی ہے

تیری تاثیر ہو گئی آخر

میری تقدیر ہو گئی آخر

بند ہفتم

آبرو جائے موت کی نہ کہیں　　موت بن جائے بیکسی نہ کہیں

درد کو زندگی سمجھتے ہیں　　جاوداں ہو یہ زندگی نہ کہیں

ہُوں وُہ بیکس کہ ڈرتا رہتا ہُوں　　چھوڑ دے مُجھ کو بیکسی نہ کہیں

زخم منّت پذیرِ مرہم ہے　　چھُپ کے سُنتی ہو چاندنی نہ کہیں

غنچۂ دل میں ہے چٹک ایسی　　اِس کلی میں ہو بے کلی نہ کہیں

ہوں نفس دو نفس مثالِ سحر　　موت ہو میری زندگی نہ کہیں

گاہے ماہے ہلال آتا ہے　　ہو لبِ جان مفلسی نہ کہیں
ماہ کے بھیس میں نمایاں ہو　　اپنی تقدیر کی کجی نہ کہیں
خطِ دستِ سوال ہے اپنا　　ہو رگِ جان مفلسی نہ کہیں

قابلِ بحرِ زندگی نہ ہُوا
ٹکڑے ٹکڑے مرا سفینہ ہُوا

بندِ ہشتم

سَیر میں اب نہ دِل لگائینگے　　کس کی اُنگلی پکڑ کے جائیں گے
صُبح جانا کسی کا وُہ گھر سے　　اور وُہ رونا کہ ہم بھی جائیں گے
کھیل میں آگئی جو چوٹ کبھی　　کس کی آنکھوں سے اب چھپائیں گے
کوئی ناغہ جو ہو گیا تو کسے　　ساتھ مکتب میں لیکے جائیں گے
سُننے والے گذر گئے اے دل　　اپنے شکوے کسے سُنائیں گے
اُٹھ گئے آہ قدرداں اپنے　　لکھ کے تختی کسے دکھائیں گے

دردِ دل کی زباں نرالی ہے
تجھ کو اے خامشی سکھائیں گے

کس غضب کے نصیب ہیں اپنے
روتے آئے تھے روتے جائینگے

عید آئی ہے اے لباسِ کہن
اب ترے چاک پھر سلائیں گے

عید کا چاند آشکار ہوا
تیرِ غم کا جگر کے پار ہوا

بندِ نہم

آنکھ میں تارِ اشکِ پیہم ہے
کیا رواں آبِ خنجرِ غم ہے

دیکھ اے ضبط گر نہ جائے کہیں
اشکِ غم آبروئے ماتم ہے

اے مہِ عید تو ہلال نہیں
سینہ کاوی کو ناخنِ غم ہے

پھول ایسا ہے اشکِ چشمِ یتیم
رونقِ خانۂ محرّم ہے

اُس گلستاں میں آشیاں ہے مرا
ہر شجر جس کا نخلِ ماتم ہے

کس کے نظّارۂ مصیبت کو
ماہ بامِ فلک پہ یوں خم ہے

خونِ اُمید ہے یہ اشک نہیں
کس بُھلاوے میں چشمِ پُرنم ہے

پُوچھنا اے نفس نکل کے ذرا
کیوں اجل کا مزاج برہم ہے

اے فلک کیوں زمیں ہی برسرِ کیں؟
میری بربادیوں کو تُو کم ہے؟

ہے جو دِل میں نہاں کہیں کیوں کر
مفلسی کے ستم سہیں کیوں کر

بندِ دہم

ہاتھ اے مفلسی صفا ہے ترا
ہائے کیا تیر بے خطا ہے ترا

تیرہ روزی کا ہے تجھی پہ مدار
بدنصیبی کو آسرا ہے ترا

مایۂ صد شکست قیمت دل
دہر میں ایک سامنا ہے ترا

تو بھلا مجھ پہ کیوں نثار نہ ہو
کہ یتیمی تو مُدّعا ہے ترا

مسکراتا ہے تجھکو دیکھ کے زخم
یہ کوئی صُورت آشنا ہے ترا

التجا پر خموشئ منعم
ایک فقرہ جلا بُھنا ہے ترا

یہ بھی کیا دامنِ یتیمی ہے
نام کیسا نِکل گیا ہے ترا

موت مانگے سے بھی نہیں آتی
درد کیا زندگی فزا ہے ترا

شورِ آواز چاک پیراہن
لبِ اظہار مدعا ہے ترا

ہیں جہاں کو غموں کے خار پسند
اِس چمن کو نہیں بہار پسند

بندِ یازدہم

چمنِ خار خار ہے دُنیا
خونِ صد نوبہار ہے دُنیا

زندگی نام رکھ دیا کس نے
موت کا انتظار ہے دُنیا

ہے نسیمِ جہاں خزاں پرور
دیکھنے کو بہار ہے دُنیا

ڈھونڈ لیتی ہے اک نہ اک پہلو
درد کی غم گسار ہے دُنیا

ہے تمنّا فزا ہوائے جہاں
کیا شکستِ خمار ہے دُنیا

خون روتا ہے شوق منزل کا
رہزن و رہ گزار ہے دُنیا

جان لیتی ہے جستجو اس کی دولتِ زیرِ مار ہے دنیا

یاس و امید کا ملاوا ہے کوئی جاتی بہار ہے دُنیا

خندہ زن ہے فلک زدوں پہ جہاں چرخ کی راز دار ہے دُنیا

اہل دنیا و شرحِ دردِ جگر

رگِ بے خون و کاوشِ نشتر

بند دوازدہم

کیا قیامت ہیں غم کے آنسو بھی بڑھتا جاتا ہے دردِ پہلو بھی

نوکِ مژگاں ہے نشترِ رگِ اشک خوں فشاں ہو رہے ہیں آنسو بھی

ٹوٹی پھوٹی زباں میں کہتا ہے رنگِ احوال، دردِ پہلو بھی

سوزشِ اشکِ غم ہے برقِ مژہ جل گیا سبزۂ لبِ جُو بھی

آہ اے چشمِ اشک ریزِ یتیم خواب کا اک خیال ہے تُو بھی

حسرتِ دید غمگسار نہ پُوچھ چشم ریزاں ہیں میرے آنسو بھی

قطرۂ خوں تو عام ہے لیکن
دل کو کہتے ہیں دردِ پہلو بھی
آ ترے صدقے اے خیالِ پدر
عید کا چاند ہوگیا تو بھی
ہائے اے برق بن گئی گر کر
میرے حاصل کی آبرو تو بھی
عید کا چاند اضطراب بنا
طاقِ آتشکدہ عذاب بنا

بندِ سیزدہم

طعن دیتا ہے کس بلا کے مجھے
آسماں بن گیا ستا کے مجھے
ہائے بے خود کیا تصوّر نے
داستانِ عرب سنا کے مجھے
ہے تصدّق مری یتیمی پر
کوئی نقشہ دکھا دکھا کے مجھے
چاہیئے اے خیال پاسِ ادب
تو کہاں لے گیا اُڑا کے مجھے
ہائے اے آتشِ فراقِ پدر
خاک کر دے جلا جلا کے مجھے
اے یتیمی فتادگی بن کر
چھوڑنا خاک میں ملا کے مجھے

لبِ اظہار وا ہوا نہ کبھی　　تم نے دیکھا ہے آزما کے مجھے
پردہ رکھ لے شکستہ پائی کا　　کارواں لے چلے اٹھا کے مجھے
زندگی کیا اسی کو کہتے ہیں　　کہ مزے مل گئے فنا کے مجھے

عرش ہلتا ہے جب یہ روتے ہیں
کیا یتیموں کے اشک ہوتے ہیں

بندِ چہاردہم

کیا ہنسی ضبط کی اُڑاتے ہیں　　اشک آ آ کے چھیڑ جاتے ہیں
اِک بہانہ ہلالِ عید کا ہے　　قوم کو حالِ دِل سُناتے ہیں
کِس مزے کی ہے داستاں اپنی　　قوم ہنستی ہے ہم ہنساتے ہیں
دیکھ اے زندگی مرے آنسو　　یہ ترے نقشِ نو مٹاتے ہیں
ہاں بتا اے فلک کہ طفلی میں　　درد کو کس طرح چھپاتے ہیں
خاکِ راہِ فنا میں اُڑتی ہے　　منہ کفن میں چھپائے جاتے ہیں

وہ بھی ہوتے ہیں اے خُدا کوئی　　　جو مصیبت کو بھول جاتے ہیں

اس طرح کی ہے داستاں اپنی　　　ہے عیاں جس قدر چھپاتے ہیں

ہم نہ بولیں تو خامشی کہہ دے　　　یہ قیامت کے دُکھ اُٹھاتے ہیں

آبرو بڑھ گئی خموشی کی

یہ زباں بن گئی یتیمی کی

بند پانزدہم

رنگِ گلشن جو ہو خزاں کے لئے　　　قہر ہوتا ہے باغباں کے لئے

چاہیئے پاس برق کا اے دل　　　ہو خسِ خشک آشیاں کے لئے

اُڑ کے آتا ہے رنگِ عارضِ زرد　　　کس مصیبت کی داستاں کے لئے

حال دل کا سُنا دیا سارا　　　کچھ بھی رکھا نہ رازداں کیلئے

ہے اقامت طلب جدا رمری　　　قوم ہو خضر اس مکاں کے لئے

ہاتھ اے قومِ مہرباں تیرا　　　ابر ہے کس کے گلستاں کے لئے

حال اپنا اگر تجھے نہ کہیں — اور رکھیں اسے کہاں کے لئے
صورتِ شمعِ خانۂ مفلس — خامشی ہے مری زباں کیلئے
اب مگر ضبط کا نہیں یارا — لب ترسنے لگے فغاں کیلئے

دردمندوں کی درد خواہ ہے قوم
بے کسوں کی اُمیدگاہ ہے قوم

اشکِ خوں

دس بند یا ایک سو دس شعر کا یہ ترکیب بند اس ماتمی جلسے میں پڑھا گیا۔ جو ملکہ وکٹوریا کی وفات پر لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ ملکہ کا انتقال ۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو ہوا۔ اتفاق سے اس روز عید الفطر تھی۔ پہلے دو بندوں میں اسی طرف اشارہ ہے۔ یہ مرثیہ مطبع خادم التعلیم میں چھاپ کر کتابچے کی شکل میں شائع کیا گیا تھا جو میرے پاس اب بھی موجود ہے۔

(محمد عبد اللہ قریشی)

اے آہ آج برقِ سرِ کوہسار ہو
یا تیر بن کے میرے کلیجے کے پار ہو
ہو ٹکڑے ٹکڑے ٹوٹ کے اے رشتۂ نفس
اے مُرغِ رُوح، بازِ اجل کا شکار ہو

اے دامنِ دریدۂ پیراہنِ حیات

ہاں آج زیبِ دیدۂ خُوں نابہ بار ہو

پھرتے ہیں ڈھُونڈتے اجلِ ناگہاں کو ہم

ہاں اے حیاتِ خضر نگاہوں میں خار ہو

اے افسری کے تاج گریباں کو چاک کر

اے کرُسئ طلائے شہی سوگوار ہو

اے دِل اگر جفا طلبی کا مذاق ہے

مرہونِ تلخئ ستمِ روزگار ہو

پسنے کا جب مزا ہے کہ اے آسیائے غم

پِس پِس کے جان اپنی مثالِ غُبار ہو

میّت اُٹھی ہے شاہ کی تعظیم کے لئے

اقبال اڑ کے خاکِ سرِ رہ گزار ہو

مدّت کے بعد تجھ کو ملے ہیں غمِ فراق

ہم تجھ پہ صدقے جائیں تو ہم پر نثار ہو

چلتے رہ حیات ، مگر گھات میں خوشی

کونے لگی ہوئی نہ سرِ راہ گزار ہو

آئی ادھر نشاط ، ادھر غم بھی آگیا

کل عید تھی تو آج محرّم بھی آگیا

بندِ دوم

ہاں اے ہلالِ عید خدا کی قسم تُجھے

خواہانِ عیش کیا نظر آتے ہیں ہم تجھے ؟

اے جامِ بزمِ عید مقدّر یہ تھا ترا

لبریز کرنے آئے مے اشکِ غم تُجھے

ایسی گھڑی میں تیری افق پر ہوئی نمُود
سمجھا نہ کوئی حلقۂ ماتم سے کم تجُھے

ایمن تھے غم سے ہم مگر اے خنجرِ ستم
کرنے تھے ذبح طائرِ بامِ حرم تجُھے

کھلتی ہے کچھ ہمارے مقدّر پہ یہ کجی
سجتا نہیں نظر میں ہماری یہ خم تجھے

تیغِ ستم سے بڑھ کے رہیں تیری تیزیاں
ہم اپنے لب سے مانگ کے دیتے ہیں دم تجُھے

بیماریٔ نشاط اگر ہے تو صُبحِ غم
پڑھ کر کرے گی سورۂ والحشر دم تجھے

ہاں اے شعاعِ ماہ شبِ اوّل طرب
دل جانتا ہے تیرِ کمانِ ستم تجُھے

صُورت وہی ہے نام میں رکھّا ہُوا ہے کیا

دیتے ہیں نام ماہ محرّم کا ہم تُجھے

اے شامِ عید اپنے مہِ نو سے پُوچھ لے

سمجھا ہُوا ہوں صُبحِ دیارِ عدم تُجھے

کہتے ہیں آج عید ہوئی ہے ہُوا کرے

اِس عید سے تو موت ہی آئے خُدا کرے

بندِ سوم

قربان تیرے اے ستمِ روزگار آج

آنکھوں میں ہر نگہ بھی ہوئی اشک بار آج

اس روز رنج و غم سے تو آسان تھی یہی

محشر کی صبح ہو نہ گئی آشکار آج

دل کا تو ذِکر کیا ہے کہ دِل کا قرار بھی
سیماب کی طرح سے ہُوا بے قرار آج

سوزِ الم نے جاں کو جلایا ہے اِس طرح
کا نونِ دل سے اُٹھتے ہیں غم کے شرار آج

ناکامیوں نے اس کو سُنادی وہ کیا خبر
اُمید دل میں ہوتی ہے دیوانہ وار آج

ہاں اے دلِ حزیں الموں کا یہ دَور ہے
ہو طوفِ شمعِ غم تجھے دیوانہ وار آج

مثلِ سمُوم تھی یہ خبر کس کی موت کی
گلزارِ دل میں آ کے لگے غم کے خار آج

پژمُردہ ہوگیا گُلِ بستانِ افسری
خُوں ہو رہی ہے باغِ جہاں میں بہار آج

اقلیمِ دل کی آہ شہنشاہ چل بسی
ماتم کدہ بنا ہے دلِ داغدار آج
تو جس کی تخت گاہ تھی اے تخت گاہِ دل
رخصت ہوئی جہان سے وہ تاجدار آج
فرماں نہ ہو دلوں پہ تو شانِ شہی نہیں
سونے کا تاج کوئی نشانِ شہی نہیں

بندِ چہارم

شاہی یہ ہے کہ اور کا غم چشمِ تر میں ہو
شاہنشہی پہ نشانِ غریبی نظر میں ہو
شاہی یہ ہے کہ آنکھ میں آنسو ہوں اور کے
چلّائے کوئی درد کسی کے جگر میں ہو

غم دِل میں اَور کا ہو خوشی دِل میں اَور کی
کوئی گرے شکست کسی کی کمر میں ہو

بے تابیاں جو اَور کی ہوں اپنے دل میں ہوں
جو درد اَور کا ہو وُہ اپنے جگر میں ہو

پامالِ فکرِ غیر رہے تخت گاہ پر
آئے کسی پہ تیغ، کسی کی سپر میں ہو

معمور ہو شرابِ محبّت سے جامِ دِل
جو دل میں ہو نہاں وُہ نمایاں نظر میں ہو

جو بات ہو صدا ہو لبِ جبرئیل کی
تقدیر کی مُراد دِلِ دادگر میں ہو

ہو چشمِ معدلت کے ستارے کی روشنی
مانگے اماں عدُو تو مروّت نظر میں ہو

شہرت کے آسمان پہ روشن ہو اِس طرح

ہو مہر میں وُہ نور، نہ وُہ ضو قمر میں ہو

فرمان ہوں دِلوں کی ولایت میں اس طرح

جس طرح نُور رشتۂ تارِ نظر میں ہو

اے ہند تیری چاہنے والی گُذر گئی

غم میں ترے کراہنے والی گُذر گئی

بندِ پنجم

اے بحر، حکمراں جو زمینوں کی تھی گئی

آغوش موج جس کے سفینوں کی تھی گئی

موجیں رواں ہوں خون کی چشمِ حباب سے

وُہ آبرو جو تیرے خزینوں کی تھی گئی

دزدِ اجل کی تاک بھی کیسی غضب کی تھی
انگشتری جو دِل کے نگینوں کی تھی گئی

اے ہند تیرے سر سے اُٹھا سایۂ خُدا
اِک غم گسار تیرے مکینوں کی تھی گئی

اے ہند جو فضیلتِ نسواں کی تھی دلیل
تیرے گھروں کی پردہ نشینوں کی تھی گئی

ہو سوگوار آج خواتینِ ہند تُم
جو داستاں تمھارے شبینوں کی تھی گئی

خوں نابہ بار آج ہو اَے چشمِ سلطنت
واقف جو تیرے سارے قرینوں کی تھی گئی

اے سال قرنِ[1] نو یہ ستم تو نے کیا کِیا
عزّت ذرا جو تیرے مہینوں کی تھی گئی

---

[1] نئی صدی کا پہلا سال

تو آج سر بہ خاک ہو سیّارۂ زمیں
رونق جو تیرے سارے مکینوں کی تھی گئی
صرفِ بُکا ہے جان سلاطینِ روزگار
دہلیز جس کی عید جبینوں کی تھی گئی

ہو موت میں حیات، ممات اس کا نام ہے
صدقے ہو جس پہ خضر وفات اس کا نام ہے

بندِ ششم

جان نزار آکے لبوں تک اٹک گئی
آنکھوں سے خون بن کے تمنّا ٹپک گئی
روزِ طرب جہاں میں سیہ پوش ہو گیا
اے روزگارِ غم تری قسمت چمک گئی

آئی جو پاس خنجرِ عُریاں لئے ہوئے

ڈر کر اُمید گوشۂ دل میں دبک گئی

جادُو نگاہ دیدۂ صیّاد تھی کوئی

دیکھا جو آنکھ بھر کے تو بُلبل پھڑک گئی

اے شمعِ بزمِ ماتمِ سلطانۂ جہاں

کیا تھی جھلک تری کہ ثریّا تلک گئی

ماتم بھی وُہ دِیا کہ ہزاروں میں ایک ہے

آنکھ اپنی انتخابِ فلک پر پھڑک گئی

لالی اُفق پہ آنکھ نے دیکھی جو شامِ عید

اِک بات تھی کہ خونِ جگر کو کھٹک گئی

سمجھی ہے ایسے آپ کو آئی ہوئی اجل

لو میری خامشی سے قضا بھی بہک گئی

اے درد آ مرے چمنِ دل کی سیر کر
غم کی کلی ہوائے نفس سے چٹک گئی
اے دردِ جاں گداز خدا کے لئے نہ تھم
ہم بھی اُٹھیں گے ساتھ جو تیری کسک گئی

ہر آنکھ، دل بہ ریزشِ طوفاں نہادہ ہے
مژگانِ چشم کیا رگِ ابرِ کشادہ ہے

بندِ ہفتم

ماتم میں آرہے ہیں یہ ساماں کیئے ہوئے
داغِ جگر کو شمعِ شبستاں کیئے ہوئے
تاریک ہو گیا ہے زمانہ مگر قضا
آجائے غم کی شمع فروزاں کیے ہوئے

رکھتا ہوں طائرِ دلِ رنگیں نوا کو مَیں
پہلو کو غیرتِ چمنستاں کیے ہوئے

لکھتا ہوں شعر دیدۂ خوں بار سے مگر
کاغذ کو رشکِ بابِ گلستاں کیے ہوئے

ماتم میں لے گیا ہوں دلِ پاش پاش کو
آزاد جاں گدازیٔ درماں کیے ہوئے

ہر زخمِ دل کو ماتمِ خاتونِ دھر میں
بیٹھے ہیں مستِ ذوقِ نمکداں کیے ہوئے

مغرب کے آسماں پہ چمکتی ہے تیغِ غم
جوہر کو رازدارِ رگِ جاں کیے ہوئے

لے اے عروسِ ہند تری آبرو گئی
آنکھوں کو اشکِ غم سے درخشاں کیے ہوئے

برطانیہ تو آج گلے مل کے ہم سے رو

سامانِ بحر ریزیٔ طوفاں کیے ہوئے

بوتے ہیں نخلِ آہ کو باغِ جہاں میں ہم

ممنونِ آبِ دیدۂ گریاں کیے ہوئے

آہم چو سرو در چمنِ روزگار ماند

ایں مصرعِ بلند زمن یادگار ماند

بند ہشتم

گیا منزلِ عدم کو ہمارا نفس گیا

یہ سب سے پہلے صورتِ بانگِ جرس گیا

آ اے ہجومِ غم ترے قربان جاؤں میں

اُجڑا ہوا تھا شہر مرے دِل کا بس گیا

ہو ہو کے پُرزے خارِ غمِ سینہ سوز سے
تن سے نکل کے دامنِ موجِ نفس گیا

ایسا اثر ہے گریۂ آہن گداز سے
اشکوں کے ساتھ ہل کے ہمارا قفس گیا

اُٹھا وہ ابر گوشۂ مغرب سے شعلہ ریز
مشرق سے بڑھ کے ہند پہ آکر برس گیا

وُہ ضربِ غم لگی ہے کہ ٹُوٹا ہے بند بند
کیا مُرغِ رُوح توڑ کے اپنا قفس گیا

نکلا وُہ مارِ صحنِ گلستانِ عیش سے
دل کو، جگر کو، سینے کو، پہلو کو ڈس گیا

اے روز تو پہاڑ تھا یا غم کا روز تھا
دن بن کے تُو چڑھا تھا پہ ہوکر برس گیا[1]

---

[1] غم کے باعث دن سال کے برابر ہو گیا۔

لا گلشنِ عدم سے اسے اے سمومِ غم
بُوئے گُلِ اجل کو مرا جی ترس گیا
آنکھوں کی راہ کیوں نہ گیا بن کے جُوئے خُوں
دم بھی گیا تو لے کے یہ جی میں ہوس گیا
شہرہ ہُوا جہاں میں یہ کس کی وفات کا
ہے ہر ورق سیاہ بیاضِ حیات کا

بندِ نہم

ہاں بُھولنا نہ موجۂ بادِ سحر کہیں
ہو مُلکِ نیستی میں جو تیرا گذر کہیں
مانگی تھی ہم نے آج اجل کے لئے دُعا
صدقے نہ ہو گیا ہو دُعا پر اثر کہیں

ٹلتی نہیں ہے شورِ بُکا سے اجل کبھی
اس تیغِ جاں ستاں کی نہیں ہے سپر کہیں

دُونی تھی جن کی شان سے ہیروں کی آبرو
وُہ آج کر گئے ہیں جہاں سے سفر کہیں

اے کوہِ نُور تو نے تو دیکھے ہیں تاجور
دیکھا ہے اس طرح کا کوئی تاجور کہیں؟

دیتے ہیں تجھ کو دامنِ کہسار کی قسم
اس شان کا ملا ہے تجھے دادگر کہیں؟

بن کر چراغ سارے زمانے میں ڈھونڈنا
کہنا ہمیں بھی ایسا جو آئے نظر کہیں

جس کی ضیا سے آنکھ چکاچوند تھی تری
دُنیا میں اب نہیں وُہ جبیں جلوہ گر کہیں

تو کیا کسی پہ گوہرِ جاں تک نثار تھے

پیدا جہاں میں ہوتے ہیں ایسے بشر کہیں

صورت تری ہے اشکِ جگر سوز کی طرح

قرباں ہو نہ جائے ہماری نظر کہیں

ہلتا ہے جس سے عرش یہ رونا اسی کا ہے

زینت تھی جس سے تجھکو جنازا اسی کا ہے

بندِ دہم

پیغام خانہ سوزیٔ دل بار بار دے

فرصت نہ دو گھڑی نفسِ شعلہ بار دے

دورِ جنوں میں جائیے جو دشتِ عدم کو دل

پہلے قدم پہ جامۂ ہستی اُتار دے

پھُونکا ہے غم کی آگ نے جانِ نزار کو
ہم کو تسلّیاں دلِ آشفتہ کار دے

جس کا دِلوں پہ راج ہو مرتا نہیں کبھی
صدیاں ہزار گردشِ دوراں گذار دے

رہتا ہے دِل میں صُورتِ حرفِ نگیں وُہ نام
شُہرت جسے جہان میں پروردگار دے

وکٹوریہ نہ مُرد کہ نامِ نکو گذاشت
ہے زندگی یہی جسے پروردگار دے

اے غم کشانِ دُودۂ شاہی خُدا تمھیں
اس دردِ جاں گذا میں شکیب و قرار دے

رفتار اس کے نقشِ قدم پر کرے نصیب
یہ مِہرِ مادری کی تمھیں یادگار دے

اے باغِ ہند تیرا خیاباں بجائے گُل
موتی بجائے دامنِ ابرِ بہار دے

پژمُردہ کر گئی ہے جو بادِ خزاں تجھے
صد نوبہارِ ناز تجھے روزگار دے

مرحوم کے نصیب ثوابِ جزیل ہو
ہاتھوں میں اپنے دامنِ صبرِ جمیل ہو

ہم نچوڑیں گے دامن

(یہ نظم اقبالؔ نے ایک دوست کی فرمائش پر آٹھ دس منٹ میں کہی تھی)

سراپا ہوُا مثلِ آغوشِ دریا ‏‏ نہانے کو اُترا جو وُہ رشکِ گلشن

پئے دید کھولیں حبابوں نے آنکھیں ‏‏ اُٹھائی نظارے کو موجوں نے گردن

اسیرِ خمِ زلف کیونکر نہ ہو خضر ‏‏ یہ قامت، یہ عارض، یہ سینہ، یہ جوبن

خمِ زلف موجوں نے آکر اُڑائے ‏‏ غضب ہے پڑے رہزنوں کو بھی رہزن

ادھر سر حبابوں نے ساحل سے ٹپکے ‏‏ نہا کر جو نکلا وُہ دریا سے پُرفن

ہوئی خونفشاں چشمِ گرداب ایسی ‏‏ کہ دریا ہوُا غیرتِ صحنِ گلشن

جو دستِ حنائی سے دامن نچوڑا ‏‏ کہا مَیں نے اے رُوکشِ شمعِ روشن

کہیں آگ سے بھی ٹپکتا ہے پانی ‏‏ بجا ہے جو کہیئے تجھے سامری فن

مری چشمِ گریاں کی تجھ کو قسم ہے

صنم چھوڑ دے، ہم نچوڑیں گے دامن

(کشمیری گزٹ ستمبر ۱۹۰۱ء)

پنجۂ فولاد

(منشی محمد الدین فوقؔ کے ہفتہ وار اخبار کے

متعلق جو ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا تھا۔)

"پنجۂ فولاد" اِک اخبار ہے　　جس سے سارا ہند واقفکار ہے

دفترِ اخبار ہے لاہور میں　　جس کا کوچہ کوچہ کوئے یار ہے

ہے روش اس کی پسندِ خاص و عام　　واہ وا کیا معتدل اخبار ہے

غیر سے نفرت نہ اپنوں سے بگاڑ　　اپنے بیگانے کا ہر دم یار ہے

سطر سطر اس کی مفید ملک و قوم　　کوئی کہہ دے یہ خبر بے کار ہے

دید کے قابل نہ ہو کیوں "بزمِ فوق"　　شمع اس محفل کی یہ اخبار ہے

"ضامنِ صحت" کا ایسا ہے عمل　　وہ ضمانت کے لئے تیار ہے

ہے "تجارت" کا بھی کالم کیا مفید　　یوسفِ معنی کا یہ بازار ہے

وہ "لطائف" ہیں کہ پڑھتے ہی جنھیں
لوٹنے میں دِل کبوتر وار ہے

کیوں نہ نظم و نثر کا چرچا رہے
جب ایڈیٹر ناظم و نثّار ہے

"سیٹلمنٹ آفس" کا بھی ہے بندوبست
شاہد اِن دعوؤں کا خود اخبار ہے

ہے مدلّل رائے اس اخبار کی
ہے وُہ کافر جس کو کچھ انکار ہے

رائے زن اس سے نہیں بڑھکر کوئی
منصفوں کو اس کا آپ اقرار ہے

جتنے ہیں ہمعصر دیکھیں غور سے
فقرے فقرے سے ٹپکتا پیار ہے

تین رائج سکّے قیمت سال کی
اس سے سستا اور کون اخبار ہے

اور پھر انعام میں ناول ہیں مُفت
واہ کیا سودا ہے کیا بیوپار ہے

آٹھویں دن حاضری لے لیجئے
تابعِ فرمان خدمت گار ہے

سَیر اس گُلشن کی کر کے دیکھئے
ایک گلشن رشکِ صد گلزار ہے

رنگ آزادی ہے ہر مضمون میں
سرو ہوکر بھی یہ میوہ دار ہے

کون ہے اِس بانکے پرچے کا مدیر
بات یہ بھی قابلِ اظہار ہے

لیجئے مُجھ سے جوابِ مختصر یہ معمّا کچھ نہیں دُشوار ہے
نام ہے اس کا محمد دین فوقؔ عمُر چھوٹی ہے مگر ہُشیار ہے
شوق ہے مضموں نویسی کا اسے طبع گویا ابرِ گوھر بار ہے

گشت کے عالم میں دیکھا تھا اسے
آدمی ہُشیار واقف کار ہے

بزمِ فوق ، ضامنِ صحت ، تجارت ، مذاقِ سخن ، مشاہیر ، لطائف ۔سیٹلمنٹ آفس وغیرہ اس اخبار کے مستقل کالم تھے ۔ اقبالؔ اس اخبار میں اپنا کلام چھپنے کیلئے دیا کرتے تھے ۔

انجمن حمایت اسلام لاہور کا سترھواں سالانہ جلسہ ۲۱ - ۲۲ - اور ۲۳ فروری

۱۹۰۲ء کو اسلامیہ کالج کے وسیع صحن میں منعقد ہوا - اس میں اقبالؔ

نے تین نظمیں پڑھیں - ۲۲ر فروری کے دوسرے اجلاس میں جو

خان بہادر محمد برکت علی خان پنشنر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی صدارت

میں منعقد ہوا ہز آنر سر میکورتھ ینگ لفٹننٹ گورنر صوبہ پنجاب تشریف

لائے - ان کی معیت میں ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب ڈبلیو - بل بھی

تھے - اقبالؔ نے اس موقع پر "خیر مقدم" نظم پڑھی -

اسی رات پانچویں اجلاس میں جو خان بہادر شیخ حاجی خدا بخش

ڈسٹرکٹ جج گورداسپور منعقد ہوا اقبالؔ نے اپنے دلآویز لہجے

میں "دین و دنیا" کے عنوان سے نظم پڑھی - اس نظم سے بعض اصحاب

کو اپنی خوش فہمی سے کچھ بدگمانی اور ناراضگی سی پیدا ہو گئی۔ مگر اقبالؔ نے نہایت دُور اندیشی سے اس بدگمانی کو دوسرے دن رفع کر دیا۔

۲۳ر فروری ۱۹۰۲ء کو اتوار کے دوسرے اجلاس میں جو میاں نظام الدین سب جج راولپنڈی کی صدارت میں منعقد ہوا اقبالؔ نے اپنی نظم "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے" پڑھ کر سُنائی۔ اس نظم کی مطبوعہ کاپی دس دس رُوپے میں فروخت ہوئی۔ تینوں نظمیں درجِ ذیل ہیں :-

زہے نشاطِ فراواں کہ اخترِ تقدیر
چمک رہا ہے اُبھر کر مثالِ مہرِ مُنیر
کیا ہے آنکھ نے ممدوح انتخاب ایسا
صفت سے جس کی زبانِ قلم میں ہے تاثیر

خوشا نصیب وُہ گوہر ہے آج زینتِ بزم
کہ جس کی شان سے ہے آبروئے تاج و سریر

وُہ کون زیب دہِ تختِ صوبۂ پنجاب
کہ جس کے ہاتھ نے کی قصرِ عدل کی تعمیر

عجب معاملہ ہے کچھ ولایتِ دِل کا
کہ اک نگاہ سے ہوتا ہے یہ نگر تسخیر

حضور زینتِ محفل ہیں ناز ہے ہم کو
جھلک رہی ہے نصیبوں میں سبزئ کشمیر

مزے سے سوتا ہے بے خوف دیدۂ عالم
کہ تیرے عہد کا ہے خواب بھی نکو تعبیر

بدل کے امن کے باعث ہے اصطلاحِ زبان
بجائے نالۂ زنجیر، نغمۂ زنجیر

کوئی جو غور سے دیکھے تو امن کی ہے بہار

یہ درسگاہ، یہ محفل، یہ شان یہ تعمیر

جو بزم اپنی ہے طاعت کے رنگ میں رنگین

تو درس گاہ رموزِ وفا کی ہے تفسیر

اِسی اصُول کو ہم کیمیا سمجھتے ہیں

نہیں ہے غیر اطاعت جہان میں اکسیر

مدد جہان میں کرتے ہیں آپ ہم اپنی

غریب دِل کے ہیں لیکن مزاج کے ہیں امیر

مگر حضور نے ہم پر کیا ہے وُہ احسان

کہ جس کے ذوق سے شیریں ہوُا لبِ تقریر

وُہ لوگ ہم ہیں کہ نیکی کو یاد رکھتے ہیں

اسی سبب سے زمانے میں اپنی ہے توقیر

دُعا نکلتی ہے دِل سے حضور شاد رہیں

رہیں جہان میں عظمت طرازِ تاج و سریر

عجب طرح کا نظارا ہے اپنی محفل میں

کہ جس کے حُسن پہ نازاں ہے خامۂ تحریر

ہوئے ہیں رونقِ محفل جنابِ ولیم بل

ضیائے مہر کی صورت ہے جن کی ہر تدبیر

یہ علم و فضل کی آنکھوں کا نور ہیں واللہ

انہیں کی ذات سے حاصل ہے مہر کو تنویر

خدا انھیں بھی زمانے میں شادکام رکھے

یہ وُہ ہیں دہر میں جن کا نہیں عدیل و نظیر

قمر کے گرد ستارے ہیں ہم عناں کیا ہیں

ہے جس طرح کا شہنشہ اسی طرح کے وزیر

خوشا نصیب کہ یہ ہمرہِ حضور آئے

ہماری بزم کی یکبار بڑھ گئی توقیر

بڑھے جہان میں اقبال اِن مشیروں کا

کہ ان کی ذات سراپا ہے عدل کی تصویر

دین و دُنیا

دہلی دروازے کی جانب ایک دن جاتا تھا مَیں

شام کو گھر بیٹھے رہنا قابلِ الزام ہے

خضر صُورت مولوی صاحب کھڑے تھے اِک وہاں

ہم مُسلمانوں میں ایسی مولویّت عام ہے

وعظ کہتے تھے "کوئی مسلم نہ انگریزی پڑھے

کفر ہے آغاز اس بولی کا کُفر انجام ہے"

میں نے یہ سُن کر کیا اُن کو مخاطب اس طرح

آپ کا ہونا بھی اپنی گردشِ ایّام ہے

کیوں مُسلمانوں کی کشتی کو اُلٹ دیتے نہیں

آپ کے دل میں جو اتنی کاوشِ انجام ہے

کفر کی تعریف میں کہتے ہیں انگریزی ہے شرط
آپ کی منطق بھی حضرت قابلِ انعام ہے

پھر اسی پر اکتفا کرتے نہیں، کہتے ہیں یہ
مذہب منصور ہے مقبولِ خاص و عام ہے

واہ کیا کہنا ہے کیا تاثیر ہے کیا وعظ ہے
آپ کی ہر بات گویا بمبئی کا آم ہے

ادّعائے حُبِّ دیں ہے آپ کو اس وعظ پر
ایسی حُب کو لام کی تشدید سے سلاّم ہے

مسلموں کو فکر دیں ہو فکرِ دُنیا کچھ نہ ہو
کچّے حنظل کی طرح یہ بھی خیالِ خام ہے

بندہ پرور اب تو ہم چالوں میں آنے کے نہیں
آپ کی دیں داریوں کا راز طشت از بام ہے

خوب قرآں کو بنایا دامِ تزویر آپ نے
کامیابی کیوں نہ ہو حضرت یہ خاصا دام ہے

صدقے جاؤں فہم پر دُنیا نہیں دیں سے الگ
یہ تو اِک پابندیٔ احکامِ دیں کا نام ہے

بندہ پرور بندگی اپنی یہیں سے ہو قبُول
واعظ اب ایسا صدائے مُرغِ بے ہنگام ہے

ان سے پوچھو ہند ہی کیا رہ گیا تھا آپ کو
اور بھی تو دیس ہیں آخر جہاں آرام ہے

باندھیئے بستر کہ ان وعظوں کی خاطر سامنے
انڈیمن ہے، چین ہے، جاپان ہے، آسام ہے

جب کہا حضرت! کہ ہیں اب ڈھنگ ہمدردی کے اور
دین کی تائید انگریزی پڑھوں کا کام ہے

جوش میں کیا آئے اِک سوڈے کی بوتل کھُل گئی

گالیوں کے بس سے منہ اُن کا چھلکتا جام ہے

ایسے دینداروں سے تنگ آئے ہیں آخر کیا کریں

آج سُنتے ہیں کہ جیمسٹ[۱] جی کے ہاں لیلام ہے

آپ کی تعریف لکھنی ہے قلم کو اس طرح

جس طرح گھوڑے کے حق میں سنکھیا بادام ہے

موچی دروازے میں ہیں فخرِ اطبّائے جہاں

ان سے امیدِ شفا لیکن خیالِ خام ہے

بیچتے ہیں برف کی قفلی دسمبر میں چہ خوش

ایسے دینداروں کا سر بے عینؔ قافؔ و لامؔ ہے

نظم چھپوانے جو صدّیقی پریس میں مَیں گیا

مطبع مطبوع ہے مشہورِ خاص و عام ہے

---

[۱] جیمسٹ جی ایک پارسی تھا جس کا نیلام گھر اس زمانے میں بہت مشہور تھا۔

ہیں یہاں اک دوست کالج کے زمانے سے مرے

آپ کے دم سے پریس کی عزّت واکرام ہے

نام محی الدین ہے کرتے ہیں وہ احیائے دیں

آپ کا دینی کتابوں کی اشاعت کام ہے

مَیں نے یہ پُوچھا کہ حضرت آپکو فرصت تو ہے

نظم چھپوانی ہے مُجھ کو اک ذرا سا کام ہے

دُکھ نہ جائے دیکھنا شاعر کا دِل انکار سے

یہ وُہ تلخی ہے کہ مثلِ تلخیٔ دُشنام ہے

آج کل لوگوں کو ہے انکار کی عادت بہُت

نام بے چارے حسینوں کا یُونہی بدنام ہے

ہنس کے فرمانے لگے یہ انجمن کا کام ہے

انجمن کا کام کیا ہے خدمتِ اسلام ہے

ہم کریں اس کام کو سو کام اپنے چھوڑ کر
آپ کیا سمجھے ہیں حضرت یہ بھی کوئی کام ہے

چھاپ دینا نظم کا مجھ پر گراں کوئی نہیں
خدمتِ دیں اپنے دل کو جامۂ احرام ہے

ہو اگر مجھ کو نہ فرصت اور سے چھپوا کے دوں
ہو نہ اتنا بھی تو جھوٹا دعویٔ اسلام ہے

نظم ہے آخر کوئی طاعون کا ٹیکہ نہیں
چھاپنا چاہے جو کوئی دس منٹ کا کام ہے

بات یہ چھوٹی سی ہے لیکن مروت کو تو دیکھ
حق تو یہ ہے جوشِ ہمدردی اسی کا نام ہے

یہ مروت ہو عزیزوں کی نگاہوں میں اگر
پھر وہی ہم ہیں وہی شوکت وہی اسلام ہے

اِس کہانی کے بیاں سے تھی غرض اک اَور ہی
میرے ہر مصرع میں مخفی صنعتِ ایہام ہے

اِس طرحِ دُنیا کا بندہ بھی نہ ہونا چاہیئے
ایسی دُنیا ہو تو نورالدّین گنگا رام ہے

چاہیئے ہر کام میں ہو دین کی خدمت کا پاس
حضرتِؐ مدفونِ یثرب کا یہی پیغام ہے

رُوح ہے جب تک بدن میں عشق ہمجنسوں سے ہو
عشق بھی اِک مذہبِ اسلام ہی کا نام ہے

ہے دماغوں کی لطافت کچھ اِسی کا سوز و ساز
عشق اس دُنیا کی انگیٹھی میں عُودِ خام ہے

سر جُھکائے ایک دِن جاتا تھا ٹکسالی کو مَیں
دائیں بائیں گھورنے سے آنکھ کو کیا کام ہے

آ رہا تھا میرے پیچھے کوئی یہ کہتا ہوا

آہ یہ دُنیا سراپا مایۂ آلام ہے

بابو جی درویش ہوں میں ہو چکا آٹا مرا

فکر ہے فردا کی اور دِل ہے کہ بے آرام ہے

علمِ دیں کا شوق ہے دُنیا سے مطلب کچھ نہیں

دال دِل کو اپنے دال دین سے ادغام ہے

گاؤں سے یاں کھینچ لایا ہے مجھے پڑھنے کا شوق

علمِ دیں کے ساتھ اپنے دل کو نسبت تام ہے

یہ کہا اور جھٹ دکھادی اک پُرانی سی کتاب

مَیں نے یہ سمجھا کوئی ڈِگری ہے یا اسٹام ہے

مَیں نے یہ سُن کر کہا دُکھتے ہوئے دِل سے اسے

واہ کیا نیّت ہے کیا اوقات کیا اسلام ہے

خوار ہے تُو جیسے اسٹیشن پہ ہو بلٹی کا مال

تیری دینداری کا یہ ذِلّت ہی کیا انجام ہے

نیچری مجھ کو سمجھ کر ہو گئے کافُور آپ

آج کل سچّی نصیحت کا یہی انعام ہے

الغرض دیں ہو تو اس کیساتھ کچھ دُنیا بھی ہو

ورنہ روزِ روشنِ اسلام کی پھر شام ہے

دین، دُنیا کا محافظ ہے اگر سمجھے کوئی

جیسے بچّے کے گلے میں ناخنِ ضرغام ہے

یُوں تو اس دُنیائے دُوں میں سیکڑوں امراض ہیں

پر بخیلوں کے لئے چندہ بھی اک سرسام ہے

چندہ جب لینے گئے کہلا دیا بیمار ہیں

ٹل گئے جس دم کہا پہلے سے کچھ آرام ہے

ذِکر جب اقبالؔ کا آیا تو بول اُٹھا کوئی

رہتا ہے بھاٹی میں اِک دیوانۂ اصنام ہے

اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے

بندِ اوّل

ہم سخن ہونے کو ہے معمار سے تعمیر آج
آئینے کو ہے سکندر سے سرِ تقریر آج
نقش نے نقاش کو اپنا مخاطب کر لیا
شوخیٔ تحریر سے گویا ہوئی تصویر آج
سُن کے کیا کہتی ہے دیکھیں بادِ عنبر بارِ صُبح
لب کُشا ہونے کو ہے اک غنچۂ دلگیر آج
دیکھئے گُل کس طرح کہتا ہے احوالِ خزاں
مانگ کر لایا ہے بلبل سے لبِ تقریر آج

عشق ہر صورت سے ہے آمادۂ تزئینِ حسن

ہے پرِ پروانہ سے کارِ لبِ گلگیر آج

گرمیٔ فریاد کی آتش گدازی دیکھنا

شمع کے اشکوں میں ہے لپٹی ہوئی تنویر آج

آہ میں یارب وہ کیا اندازِ معشوقانہ تھا

جوشِ لذت میں فدا ہو ہو گئی تاثیر آج

عقدے کھل جانے کو ہیں مثلِ دہانِ روزہ دار

ہے ہلالِ عید اپنا ناخنِ تدبیر آج

دیکھیئے اِس سحر کا ہوتا ہے کس کس پر اثر

ہے دخانِ شمعِ محفل سرمۂ تسخیر آج

زینتِ محفل ہیں فرہادانِ شیریں عطا

اس محل میں ہے رواں ہونے کو جوئے شیر آج

صبر را از منزلِ دل پا بجولاں کردہ ام
گیسوئے مقصود را آخر پریشاں کردہ ام

بندِ دوم

آج ہم حالِ دلِ درد آشنا کہنے کو ہیں
اِس بھری محفل میں اپنا ماجرا کہنے کو ہیں
ہر نفس پیچیدہ ہے مانند دُودِ شمعِ طور
داستانِ دلکشِ مہر و وفا کہنے کو ہیں
دیکھئے محفل میں تڑپاتا ہے کس کس کو یہ شور
مرثیہ اپنے دلِ گُم گشتہ کا کہنے کو ہیں
بُوئے گل لپٹی ہوئی ہو غنچۂ منقار میں
ورنہ مُرغانِ چمن رنگیں نوا کہنے کو ہیں

تجھ کو اے شوقِ جراحت دیں تسلّی کِس طرح
آہ ! یہ تیرِ نظر بھی بے خطا کہنے کو ہیں

قصّہء مطلب طویل و دفترِ تقریر تنگ
خود بخود کوئی سمجھ جائے کہ کیا کہنے کو ہیں

محفلِ عشرت میں ہے کیا جانے کس کا انتظار ؟
آج ہر آہٹ کو ہم آوازِ پا کہنے کو ہیں

ہے سُوئے منزل رواں ہونے کو اپنا کارواں
ہم صریرِ خامہ کو بانگِ درا کہنے کو ہیں

ہے گہُرباری پہ مائل تُو جو اَے دستِ کرم
ہم تجُھے ابرِ سخا ، بحرِ عطا کہنے کو ہیں

خود بخود منہ سے نکل جانا بھی اچّھا ہے مگر
دم تو لے آخر تجُھے اے مُدّعا ! کہنے کو ہیں

باز اعجازِ مسیحا را ہویدا کردہ ام

پیکرے را باز بانِ خامہ گویا کردہ ام

بند سوم

ابر بن کر تم جو اس گُلشن پہ گوہر بار ہو

بخت سبزے کا مثالِ دیدۂ بیدار ہو

مَیں صدف، تم ابرِ نیساں، مَیں گلستاں، تُم بہار

مزرعِ نوخیز میں تم ابرِ دریا بار ہو

مَیں نتیجہ اِک حدیثِ اُمّیِٔ یثرب کا ہُوں

تم اسی اُمّی کی اُمّت کے علمبردار ہو

اِک مہِ نو آسمانِ علم و حکمت پر ہُوں مَیں

تم بھی اِک فوجِ ہلالی کے سپہ سالار ہو

نام لیوا اِک دیارِ علم و حکمت کا ہُوں مَیں

اور تم اگلے زمانوں کے وُہی انصار ہو

یاں کبھی بادِ خزاں کا رنگ جم سکتا نہیں

مَیں مُسلمانوں کا گُلشن، تم میری دِیوار ہو

تم اگر چاہو تو اِس گُلشن کے ایسے بھاگ ہوں

ہر کلی گُل ہو کے اس کی زینتِ دستار ہو

رہنے والے انتخاب ہفت کشور کے ہو تُم

کیوں نہ اس گُلشن کی نکہت رُوکشِ تاتار ہو

میری دیواروں کو چھو جائے جو اکسیرِ عطا

خاک بھی میری مثالِ گوہرِ شہوار ہو

دیکھ اے ذوقِ خریداری! یہ موقع ہے کہیں

حُسنِ یُوسف سے نہ خالی مصر کا بازار ہو

یُوسفِ علم استم و پنجاب کنعانِ من است

از دمیدِ صُبحِ حکمت چاک دامانِ من است

بندِ چہارم

مُجھ میں وُہ جادُو ہے روتوں کو ہنسا سکتا ہُوں مَیں

قوم کے بگڑے ہُوؤں کو پھر بنا سکتا ہُوں مَیں

عید ہُوں مَیں اے نگاہِ چشمِ نظّارا تری

شاھدِ مقصُود کا پردہ اُٹھا سکتا ہُوں مَیں

طیرِ حکمت باغِ دُنیا میں ہُوں اَے صیّاد اِبَیں

دام تو سونے کا بنوالے تو آسکتا ہُوں مَیں

طوسی و رازی و سینا و غزالی و ظہیر

آہ وُہ دِل کش مرقّع پھر دِکھا سکتا ہُوں مَیں

آئیں اُڑ اڑ کر پتنگے مصر و روم و شام سے

شمع اک پنجاب میں ایسی جلا سکتا ہوں میں

آزما کر تم ذرا دیکھو مرے اعجاز کو

ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ دِکھا سکتا ہوں میں

گوش بر آواز تھا مغرب کبھی جس کے لئے

وہ صدا پھر اس زمانے کو سنا سکتا ہوں میں

ناز تھا جس پر کبھی غرناطہ و بغداد کو

پھر وہی محفل زمانے کو دِکھا سکتا ہوں میں

گھر کسی کا جن کی ضو سے غیرتِ مشرق بنے

اس انوکھی شان کے موتی لُٹا سکتا ہوں میں

کارواں سمجھے اگر خضرِ رہِ ہمّت مجھے

منزلِ مقصود کا رستہ دکھا سکتا ہوں میں

از خُمِ حکمت بروں کردم شرابِ ناب را

ہاں، مبارک سرزمینِ خطّۂ پنجاب را

بندِ پنجم

بن گیا ہے دستِ سائل دامنِ گلزار کیا

باغ پر چھایا ہُوا ہے ابرِ گوہر بار کیا؟

کُچھ ہَوا ایسی چلے یارب کہ گلشن خیز ہو

خار کیا گُل کی کلی کیا غنچۂ منقار کیا؟

حُسن خود منّت کشِ چشمِ تماشائی ہُوا

اب نہیں دُنیا میں باقی طالبِ دیدار کیا؟

اِک جہاں آیا ہے گل گشتِ چمن کے واسطے

باغباں باہر نہ پھینکے گا چمن کے خار کیا؟

زندگی اپنی زمانے میں تمھارے دم سے ہے

ہے خطِ دستِ کرم میرے نفس کا تار کیا؟

ہاں جسے چھونا ہو دامانِ ثریّا کو کبھی

ایک دو اینٹوں سے اُٹھ سکتی ہے وُہ دیوار کیا

تیغ کے بھی دن کبھی تھے اب قلم کا دَور ہے

بن گئی کشور کُشا یہ کاٹھ کی تلوار کیا

خُوبیٔ قسمت سے پہنچا علم کا یُوسف یہاں

ورنہ کیا پنجاب اور پنجاب کا بازار کیا

مُجھ سے وابستہ نہیں کیا آبرُو پنجاب کی

تیر کی صورت نہیں ہیں طعنۂ اغیار کیا

آرزُوئے دِل کو بھی کہنا کوئی دُشوار ہے

کام خاموشی سے تجھ کو اے لبِ اظہار کیا

گوش را جویائے آوازِ غریباں کردۂ
شانہ را مائل بہ گیسوئے پریشاں کردۂ

بندِ ششم

کیوں نہ دیوانے ہوں لب سوزِ نہاں کیواسطے
ڈھونڈ کر محفل نکالی داستاں کے واسطے
اِس بھری محفل میں اپنا رازِ دل کہتا ہوں میں
باغ ہی زیبا ہے بلبل کی فغاں کے واسطے
طعنہ زن ہے ضبط اور لذّت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل رازداں کے واسطے
جس نے پایا اپنی محنت سے زمانے میں فروغ
ہے وہی اختر جبینِ کہکشاں کے واسطے

باغباں کا ڈر کہیں خطرہ کہیں صیّاد کا

مشکلیں ہوتی ہیں سو اِک آشیاں کے واسطے

خضرِ ہمّت کا رفیقِ راہِ منزل ہو اگر

گلستاں تیرے لئے تُو گلُستاں کے واسطے

زندگی وہ چاہیئے دُنیا کی زینت جس سے ہو

شمع روشن بن کے رہ بزمِ جہاں کے واسطے

تشنہ لب کے پاس جاتا ہے کبھی اُٹھ کر کنواں ؟

رخت کب منزل نے باندھا کارواں کے واسطے

گلُشنِ عالم میں وُہ دِل کش نظارا ڈھُونڈنا

آنکھ کو فرصت نہ ہو خوابِ گراں کے واسطے

یہ تو پوشیدہ ہے بے آرامیٔ محنت میں کچھُ

جا رہا ہے تو کہاں آرام جاں کے واسطے

روشن از نورِ مہِ حکمت شبستانِ من است
کان دُرِ گم گشتۂ مومن بدامانِ من است

بندِ ہفتم

ہاں اگر ہمّت کو اپنی جوش میں لائے کوئی
عشقِ اخواں کا اثر دُنیا کو دکھلائے کوئی

جوشِ ہمدردی میں پنہاں دولتِ ایماں ہے بس
نقشۂ خیر القرون آنکھوں کو دکھلائے کوئی

ہے پریشاں بادِ ناکامی سے گیسوئے مُراد
شانۂ دستِ عطا سے اس کو سُلجھائے کوئی

بہرِ استقبال استادہ ہے ہر گُل کی کلی
اس چمن میں صُورتِ بادِ صبا آئے کوئی

یہ گُل و گلزار صدقہ اُمّیِ یثربؐ کا ہے

دیکھنا اے باغباں غنچہ نہ مُرجھائے کوئی

مدّعا کو یہ سِکھایا شورشِ فریاد نے

خود بخود میری طرح منہ سے نکل آئے کوئی

کہہ گئی ذوقِ کرم کو شوخئ حُسنِ طلب

ہاتھ سے عاشق کا دِل بن کر نکل جائے کوئی

اِک چھٹا دریا رواں ہونے کو ہے پنجاب میں

ابر کی صُورت اُٹھے اُٹھ کر برس جائے کوئی

تاک میں بیٹھی ہُوئی ہے شوخئ دستِ طلب

دیکھئے اِس بزم سے بچ کر کہاں جائے کوئی

فکرِ دیں کے ساتھ رکھنا فکرِ دُنیا بھی ضرور

ہیں بہت دشمن کہیں دھوکا نہ دے جائے کوئی

خویش را مسلم ہمی گویند و با ما کار نیست
رشتۂ تسبیح شاں جز رشتۂ زنّار نیست

بندِ ہشتم

علم کا محبوب رونق بخشِ کاشانہ تو ہو
انجمن اپنی مثالِ بزمِ جانانہ تو ہو
پھر سماں بندھ جائے گا غرناطہ و بغداد کا
پھر ذرا بھولا ہوا تازہ وہ افسانہ تو ہو
بزم میں شوقِ مئے حکمت ہوا پیدا مگر
مے بھی بٹ جائے گی پہلے فکرِ پیمانہ تو ہو
یہ نظامیہ سلامت ہے تو پھر سعدی بہت
پر ذرا ویسا منوّر اپنا کاشانہ تو ہو

یادگار فاتحانِ ہند و اُندلس ہو تُمھیں

شانِ شاہانہ نہ ہو میری، امیرانہ تو ہو

پائمالی ہے جہاں میں ترکِ حکمت کی سزا

اس چمن سے مثلِ سبزہ کوئی بیگانہ تو ہو

آنکھ کو بیدار کر دیتی ہے یہ دِیوانگی

کوئی اِس حُسنِ جہاں آرا کا دیوانہ تو ہو

رام کر لینا زمانے کا ترے ہاتھوں میں ہے

زندگی تیری جہاں میں دِلرُبایانہ تو ہو

جل کے مرجانا چراغِ علم پر مُشکل نہیں

پہلے تیرے دِل میں پیدا نورِ پروانہ تو ہو

اَے کہ حرفِ اُطلبُوا لوکانَ بالصین گُفتۂ

گوہرِ حکمت بہ تارِ جانِ اُمت سُفتۂ

بندِ نہم

اے کہ بر دلہا رموزِ عشق آساں کردۂ

سینہ ہا را از تجلّیٰ یوسفستاں کردۂ

اے کہ صد طور است پیدا از نشانِ پائے تو

خاکِ یثرب را تجلّیٰ گاہِ عرفاں کردۂ

اے کہ ذاتِ تو نہاں در پردۂ عینِ عرب

روئے خود را در نقابِ میم پنہاں کردۂ

اے کہ بعد از تو نبوّت شد بہ ہر مفہوم شرک

بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفاں کردۂ

اے کہ ہم نامِ خدا ، بابِ دیارِ علمِ تو

اُمّیے بودی و حکمت را نمایاں کردۂ

آتشِ اُلفت بہ دامانِ ربُوبیّت زدی

عالمے را صُورتِ آئینہ حیراں کردۂ

فیض تو دشتِ عرب را مطمحِ انظار ساخت

خاکِ ایں ویرانہ را گُلشن بداماں کردۂ

دِل نہ نالد در فراقِ ماسوائے نُورِ تو

خشک چوبے را ز ہجرِ خویش گریاں کردۂ

گُل فرستادن بہ بحرِ بے کراں می زیبدش

قطرۂ بے مایہ را ہم دستِ طُوفاں کردۂ

بے عمل را لُطفِ تو لَا تَقْنَطُوا آموز گشت

بسکہ وا بر ہر کسے بابِ دبستاں کردۂ

ہاں دُعا کن بہرِ ما، اے مایۂ ایمانِ ما

پُر شُود از گوہرِ حکمت سرِ دامانِ ما

شکریۂ انگشتری

یہ نظم میں نے منشی سراج الدین صاحب میر منشی ریذیڈنسی کشمیر کی بیاض سے لی ہے۔ نظم کے ساتھ حضرت علامہؒ کا گرامی نامہ بھی ہے۔ دونوں علامہ کے اپنے قلم سے ہیں۔ ذیل میں نظم اور خط بجنسہٖ درج کیے جاتے ہیں :۔

ڈیر سراج !

دو تین روز سے طبیعت بسبب دورۂ درد کے علیل ہے۔ یہ چند شعر قلم برداشتہ آپ کے شکریہ میں عرض کرتا ہوں۔ میرا ارمغاں یہی ہے۔ اسی کو قبول کر کے مجھے مشکور کیجیئے۔ چاہیں تو پیشانی پر چند ار دو سطور لکھ کر مخزن میں بھیج دیجئے۔ والسلام

آپ کا اقبال

از لاہور

سنہ ۱۹۰۲ء

آپ نے مجھ کو جو بھیجی ارمغاں انگشتری
دے رہی ہے مہر و اُلفت کا نشاں انگشتری

زینتِ دستِ حنا مالیدۂ جاناں ہوئی
ہے مثالِ عاشقاں آتش بجاں انگشتری

تو سراپا آیتے از سورۂ قرآنِ فیض
وقف مطلق اے سراجِ مہرباں انگشتری

میرے ہاتھوں سے اسے پہنے اگر وُہ دلِ رُبا
ہو رمُوزِ بے دلی کی ترجماں انگشتری

ہو نہ برق افگن کہیں اے طائرِ رنگِ حنا
تاکتی رہتی ہے تیرا آشیاں انگشتری

ساغرِ مے میں پڑا انگشتِ ساقی کا جو عکس
بن گئی گردابۂ آبِ رواں انگشتری

ہوں بہ تبدیلِ قوافی فارسی میں نغمہ خواں
ہند سے جاتی ہے سوئے اصفہاں انگشتری

یارم از کشمر فرستاد ست چار انگشتری
چار در صورت بمعنی صد ہزار انگشتری

چار را گر صد ہزار آوردہ ام اینک دلیل
شد قبولِ دست یارم ہر چہار انگشتری

داغ داغ از موجِ مینا کاریش جوشِ بہار
مید ہد چوں غنچۂ گُل بُوئے یار انگشتری

در لہانور[1] آمد و چشمِ تماشا شُد تمام
بود در کشمیر چشمِ انتظار انگشتری

---

[1] لاہور کا دوسرا نام جس کو امیر خسروؒ قران السعدین میں استعمال فرماتے ہیں۔ (اقبال)

یار را ساغر بکف انگشتری در دستِ یار
حلقه اش خمیازهٔ دستِ خمار انگشتری

ما اسیرِ حلقه اش او خود اسیرِ دستِ دوست
اللہ اللہ دام و صیّاد و شکار انگشتری

خاتمِ دستِ سلیماں حلقه در گوشِ وے است
اے عجب انگشتری را جاں نثار انگشتری

واه چه بکشاید بدست آں نگارِ سیم تن
ماند گر زیں بیشتر سربسته کار انگشتری

من دلِ گم گشتهٔ خود را کجا جویم سُراغ
دزدیٔ دزدِ حنا را پرده دار انگشتری

راز دارِ دزد هم دزدست در بازارِ حُسن
چشمکِ دزدِ حنا را راز دار انگشتری

هر دو باهم ساختند و نقدِ دلها می برند
پخته مغز انگشتِ جاناں پُخته کار انگشتری

نو بهارِ دلفریب انگشتری در دستِ یار
بوسه بر دستش زند لیل و نهار انگشتری

بوالهوس را انگشتری طرزِ اطاعت یاد گیر
می نهد سر بر خطِ فرمانِ یار انگشتری

ماه نو قالب تهی کرد ست از حسرت بچرخ
جلوه فرما شد چو در انگشتِ یار انگشتری

ارمغانم سلکِ گوهرهاست یعنی ایں غزل
کز سرانجم نورها آمد چهار انگشتری

گشت اے اقبال مقبولِ امیرِ ملکِ حسن
کز دو ما را گرهِ آخر زکار انگشتری

آفتاب

۱۹۰۲ء

شذرہ تمہیدی

یہ نظم اگرچہ "بانگِ درا" میں موجود ہے۔ لیکن اقبالؔ کے شذرہ کے ساتھ اس نظم کو پڑھنے سے لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔ نظم مع شذرہ تمہیدی مخزنؔ میں شائع ہوئی تھی :-

"ذیل کے اشعار رِگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دُعا کا ترجمہ ہیں، جس کو گاتیری کہتے ہیں۔ یہ دُعا اعترافِ عبودیت کی صُورت میں گویا ان تأثرات کا اظہار ہے جنھوں نے نظامِ عالم کے حیرت ناک مظاہر کے مشاہدہ سے اوّل اوّل انسانِ ضعیف البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا۔ اس قسم کی قدیم تحریروں کا مطالعہ علم ملل و

انجل کے عالموں کے لیئے انتہا درجہ کا ضروری ہے۔ کیونکہ ان سے انسان کے رُوحانی نمو کی ابتدائی مراحل کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وہ دُعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک پائی جاتی ہے۔ اور جس کو برہمن اس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت اور کسی کے سامنے اسکو پڑھتا تک نہیں۔ جو لوگ محقّقین السنۂ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں اُنکو معلوم ہے کہ سرولیم جونس مرحُوم کو اس دُعا کے معلوم کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنی پڑی تھی۔ مغربی زبانوں میں اسکے بہت سے ترجمے کیئے گئے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ زبان سنسکرت کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنۂ حال میں وضاحت کیساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس مقام پر یہ ظاہر کردینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ "سوتر" استعمال کیا گیا ہے جس کیلیئے اردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ آفتاب رکھا ہے۔ لیکن اصل میں اس لفظ سے مُراد اس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسب ضیا کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے اور نیز صوفیار نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف

میں آیا ہے۔ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ ۔ اور شیخ محی الدین ابنِ عربی
فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں لیکن وُہ
خود نظر نہیں آتا" علیٰ ہٰذا القیاس افلاطون الٰہی کے مصری پیروؤں اور ایران کے قدیم
انبیاء کا بھی یہی مذہب تھا۔ ترجمہ کی مشکلات سے ہر شخص واقف ہے لیکن اس خاص
صُورت میں دِقّت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ اصل آواز کی موسیقیت اور وُہ طمانیت آمیز
اثر جو ان کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے اردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ گایتری
کے مصنف نے ملک الشعراء ٹینی سن کی طرح اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال
کئے ہیں جن میں حروفِ علّت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی لطیف موسیقیت
پیدا ہو جاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ اس مجبوری کی
وجہ سے میں نے اپنے ترجمہ کی بُنیاد اس سوکت (گفتارِ زیبا) پر رکھی ہے جس کو
سوریا نرائن اُپنشد میں گایتری مذکور کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے۔ مگر مجھے اندیشہ ہے
کہ سنسکرت دان اصحاب اس پر وُہی رائے قائم کرینگے۔ جو چیپ مین نے پوپ کا

ترجمہ ہومر پڑھ کر قائم کی تھی۔ یعنی شعر تو خاصے ہیں لیکن یہ گایتری نہیں ہے۔

محمد اقبال

اے آفتاب روحِ روانِ جہاں ہے تو　　شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو

باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا　　ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا

قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے　　ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے

ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے　　تیری نگاہ رشتۂ تارِ حیات ہے[1]

وُہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے　　دِل ہے خرد ہے روحِ رواں ہے شعور ہے

اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے　　چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے

ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو　　یزداں[2] ساکنانِ نشیب و فراز تو

---

[1] بانگ درا میں یہ مصرع یوں بدل دیا گیا ہے ع تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے۔

[2] یزداں کو قدیم حکمائے ایران اصل نور تصوّر کرتے ہیں۔ اس واسطے خالق کی جگہ یہ لفظ استعمال کیا گیا۔

تیرا کمال ہستی ہر جان دار میں
تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں

ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو
زائیدگانِ[1] نُور کا ہے تاجدار تو

نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیا تری

---

[1] یعنی دیوتا۔ سنسکرت میں لفظ دیوتا کے معنی زائیدہ نور کے ہیں یعنی ایسی ہستی جس کی پیدائش نور سے ہوئی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو دیوتاؤں کو دیگر مخلوقات کی طرح مخلوق تصوّر کرتے تھے ازلی نہیں سمجھتے تھے۔ غالباً ان کا مفہوم وہی ہوگا جن کو ہم لفظ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ فرشتوں کا وجود بھی نوری تسلیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے۔ پس ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گردانا میرے نزدیک صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

(اقبال)

فریادِ اُمّتؔ

یہ نظم اقبالؔ نے انجمن حمایتِ اسلام کے اٹھارھویں سالانہ اجلاس میں یکم مارچ ۱۹۰۳ء کو ظہر و عصر کے درمیان خان بہادر غلام احمد خان مشیرِ مال ریاست جمّوں و کشمیر کی صدارت میں (تخیلاً بآستانۂ سرورِ کائناتؐ خلاصۂ موجوداتؐ) عاشقانہ فریاد کے رنگ میں (ابرِ گہربار کے عنوان سے) پڑھی تھی۔ ازاں بعد ۱۹۱۳ء میں (باجازتِ مصنّف) "فریادِ اُمّت" کے نام سے چھاپ دی گئی۔

دِل میں جو کچھ ہے نہ لب پر اُسے لاؤں کیونکر
ہو چُھپانے کی نہ جو بات چھپاؤں کیوں کر

شوقِ نظّارا یہ کہتا ہے قیامت آئے
پھر میَں نالوں سے قیامت نہ اُٹھاؤں کیوں کر

میری ہستی نے رکھا مُجھ سے تجھے پوشیدہ
پھر تری راہ میں اس کو نہ مٹاؤں کیوں کر

صدمۂ ہجر میں کیا لُطف ہے اللہ اللہ
یہ بھی اک ناز ہے تیرا نہ اُٹھاؤں کیوں کر

زندگی تجھ سے ہے اے نارِ محبّت میری
اشکِ غم سے ترے شعلوں کو بُجھاوں کیوں کر

تُجھ میں سَو نغمے ہیں اے تارِ ربابِ ہستی
زخمۂ عشق سے تُجھ کو نہ بجاؤں کیوں کر

ضبط کی تاب نہ یارائے خموشی مجُھ کو
ہائے اس دردِ محبّت کو چھپاؤں کیوں کر

بات ہے راز کی پر مُنہ سے نکل جائیگی
یہ مئے کُہنہ خُمِ دِل سے اُچھل جائیگی

آسماں مجھ کو بجھا دے جو فروزاں ہوں میں

صورتِ شمع سرِ گورِ غریباں ہوں میں

ہوں وہ بیمار جو ہو فکرِ مداوا مجھ کو

درد چپکے سے یہ کہتا ہے کہ درماں ہوں میں

دیکھنا تو میری صورت پہ نہ جانا گلچیں

دیکھنے کو صفت تو گلِ خنداں ہوں میں

موت سمجھا ہوں مگر زندگیٔ فانی کو

نام آجائے جو اس کا تو گریزاں ہوں میں

دور رہتا ہوں کسی بزم سے اور جیتا ہوں

یہ بھی جینا ہے کوئی جس سے پشیماں ہوں میں

کنجِ عزلت سے مجھے عشق نے کھینچا آخر

یہ وہی چیز ہے جس چیز پہ نازاں ہوں میں

داغ دِل مہر کی صُورت ہے نمایاں لیکن

ہے اسے شوق ابھی، اَور نمایاں ہوُں میَں

ضبط کی جا کے سُنا اور کسی کو ناصح

اشک بڑھ بڑھ کے یہ کہتا ہے کہ طُوفاں ہوُں میَں

ہوُں وُہ مضمون کہ مُشکل ہے سمجھنا میرا

کوئی مائل ہو سمجھنے پہ تو آساں ہوُں میَں

رِند کہتا ہے ولی مُجھ کو۔ ولی رِند مجُھے

سُن کے ان دونوں کی تقریر کو حیراں ہوُں میَں

زاھدِ تنگ نظر نے مجُھے کافر جانا

اور کافر یہ سمجھتا ہے مُسلماں ہوُں میَں

کوئی کہتا ہے کہ اقبالؔ ہے صُوفی مشرب

کوئی سمجھا ہے کہ شیدائے حسیناں ہوں میَں

ہُوں عیاں سب پہ مگر پھر بھی ہیں اتنی باتیں

کیا غضب آئے نگاہوں سے جو پنہاں ہُوں میَں

دیکھ اے چشمِ عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ

جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وُہ انساں ہُوں میَں

مزرعہ سوختۂ عشق ہے حاصل میرا

درد قربان ہو جس دل پہ وُہ ہے دل میرا

قصّۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دِل

التجائے ارنی سُرخیٔ افسانۂ دِل

یا رب اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہو گی

جادۂ مُلکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دِل

ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یا رب

جل گئی مزرعۂ ہستی تو اُگا دانۂ دِل

حُسن کا گنجِ گراں مایہ تُجھے مل جاتا

تُو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دِل

عرش کا ہے کبھی کعبہ کا ہے دھوکا اس پر

کس کی منزل ہے الٰہی مرا کاشانۂ دِل

کچھ اسی کو ہے مزا دہر میں آزادی کا

جو ہُوا قیدیٔ زنجیرِ پری خانۂ دِل

اُس کو اپنا ہے جنُوں اور مُجھے سَودا اپنا

دِل کسی اَور کا دیوانہ - مَیں دیوانۂ دل

تو سمجھتا نہیں اے زاھدِ ناداں اس کو

رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانۂ دِل

ہائے کیا جانیے اِس گھر کا مکیں کیسا ہو

ہوں جو منصور سے دربان درِ خانۂ دل

خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے

وُہ اثر رکھتی ہے خاکسترِ پروانہ، دِل

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے

برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

آتی ہے اپنی سمجھ اور پہ مائل ہوکر

آنکھ کھُل جاتی ہے انسان کی بے دِل ہوکر

لوگ سودا کو یہ کہتے ہیں "بُرا ہوتا ہے"

عقل آئی مجھے پابندِ سلاسل ہوکر

آرزُو کا کبھی رونا۔ کبھی اپنا ماتم

اس سے پُوچھے کوئی، کیا دِل نے لیا دِل ہوکر

میری ہستی ہی جو تھی میری نظر کا پردہ

اُٹھ گیا بزم سے مَیں پردۂ محفل ہوکر

عین ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا
حق دِکھایا مجھے اس نقطہ نے باطل ہوکر

خلق معقول ہے محسوس ہے خالق اے دِل
دیکھ نادان ذرا آپ سے غافل ہوکر

طُور پر تُو نے جو اَے دیدۂ مُوسیٰ دیکھا
وُہی کچھ قیس نے دیکھا پسِ محمل ہوکر

کیا کہوں بے خودئ شوق میں لذّت کیا ہے
تُو نے دیکھا نہیں زاہد کبھی غافل ہوکر

راہِ اُلفت میں رواں ہُوں کبھی افتادہ ہُوں
موج ہوکر۔ کبھی خاکِ لبِ ساحل ہوکر

دمِ خنجر میں دمِ ذبح سما جاتا ہُوں
جوہرِ آئینۂ خنجرِ قاتل ہوکر

وہ مُسافر ہُوں ملے جب نہ پتا منزل کا
خود بھی مٹ جاؤں نشانِ رہِ منزل ہوکر

ہے فروغِ دو جہاں داغِ محبّت کی ضیا
چاند یہ وُہ ہے کہ گھٹتا نہیں کامل ہوکر

دیدۂ شوق کو دیدار نہ ہو کیا معنی
آئے محفل میں جو دیدار کے قابل ہوکر

عشق کا تیر قیامت تھا الٰہی توبہ
دِل تڑپتا ہے مرا طائرِ بسمل ہوکر

مئے عرفاں سے مرے کاسۂ دل بھر جائے
میں بھی نکلا ہُوں تری راہ میں سائل ہوکر

"المدد سیّدِ مکّی مدنی العرَبی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی"

لاکھ سامان ہے اِک بے سروساماں ہونا
مُجھ کو جمعیّتِ خاطر ہے پریشاں ہونا

تیری اُلفت کی اگر ہو نہ حرارت دِل میں
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مُسلماں ہونا

دل جو بربادِ محبّت ہوُا آباد ہوُا
سازِ تعمیر تھا اُس قصر کو ویراں ہونا

علم و حکمت کے مدینے کی کشش ہے مجُھ کو
لطف دے جاتا ہے کیا کیا مجُھے ناداں ہونا

کبھی یثرب میں اویسِ قرَنیؓ سے چُھپنا
کبھی برقِ نگہِ موسیِٰ عمراں ہونا

قابَ قوسین بھی ، دعویٰ بھی عبودیّت کا
کبھی چلمن کو اُٹھانا کبھی پنہاں ہونا

لُطف دیتا ہے مجھے مٹ کے تری اُلفت میں
ہمہ تن شوقِ ہوائے عربستاں ہونا

یہی اسلام ہے میرا یہی ایماں میرا
تیرے نظّارۂ رُخسار سے حیراں ہونا

خندۂ صُبح تمنّائے براہیم استی
چہرہ پرداز بحیرت کدۂ میم استی

حشر میں ابر شفاعت کا گہُر بار آیا
دیکھ اے جنسِ عمل تیرا خریدار آیا

پیرہن عشق کا جب حُسنِ ازل نے پہنا
بن کے یثرب میں وُہ آپ اپنا خریدار آیا

مَیں گیا حشر میں جس دم تو صدا یُوں آئی
دیکھنا دیکھنا وُہ کافرِ دیندار آیا

لُطف آنے کا تو جب ہے کہ کسی پر آئے
ورنہ دِل اپنا بھی آنے کو تو سو بار آیا

جوشِ سودائے محبّت میں گریباں اپنا
مَیں نے دیکھا تو نہ ہاتھوں میں کوئی تار آیا

عِشق کی راہ میں اِک سَیر تھی ہر منزل پر
نجد کا دشت کہیں مصر کا بازار آیا

مَیں نے سَو گلشنِ جنّت کو کِیا اُس پہ نثار
دشتِ یثرب میں اگر زیرِ قدم خار آیا

لیں شفاعت نے قیامت میں بلائیں کیا کیا
عرقِ شرم میں ڈُوبا جو گنہگار آیا

وُہ مری شرمِ گنہ اور وُہ سفارش تیری

ہائے اس پیار پہ کیا کیا نہ مجُھے پیار آیا

ہے ترے عشق کا مے خانہ عجب مے خانہ

یعنی ہشیار گیا اور مَیں سرشار آیا

ما عَرَفنا نے چُھپا رکھّی ہے عظمت تیری

قابَ قوسین سے کھُلتی ہے حقیقت تیری

لے چلا بحرِ محبّت کا تلاطم مجُھ کو

کشتیِ نُوحؑ ہے ہر موجۂ قلزم مجُھ کو

حُسن تیرا میری آنکھوں میں سمایا جب سے

تیرہ لگتی ہے شعاعِ مہ و انجم مجُھ کو

تیرے قربان مَیں اے ساقیِ مے خانۂ عشق

مَیں نے اک جام کہا تو نے دِیے خُم مجھ کو

خاک ہو کر یہ مِلا اوج تری اُلفت میں

کہ "فرشتوں نے لیا بہرِ تیمّم مجُھ کو"

گرد آسا سرِ دامن سے لگا پھرتا ہُوں

حشر کے روز بھُلا دو نہ کہیں تُم مجُھ کو

کوئی دیکھے تو ترے عاشقِ شیدا کا مزاج

حُور سے کہتا ہے چھیڑا نہ کرو تم مجُھ کو

موت آجائے جو یثرب کے کسی کُوچے میں

مَیں نہ اُٹھوں جو مسیحا بھی کہے قُم مجھ کو

صفتِ نوکِ سرِ خار شب فرُقت میں

چُبھ رہی ہے نگہِ دیدۂ انجم مجُھ کو

خوف رہتا ہے یہ ہردم کہ رہِ یثرب میں

طُور کی سمت نہ لے جائے توہّم مجُھ کو

تُو نے آنکھوں کے اشارے سے جو تسکیں کر دی

شورِ محشر ہُوا گُل بانگِ ترنّم مُجھ کو

اپنا مطلب مجُھے کہنا ہے مگر تیرے حضُور

چھوڑ جائے نہ کہیں تابِ تکلّم مجُھ کو

ہے ابھی امّتِ مرحوم کا رونا باقی

دیکھ اے بے خودیٔ شوق نہ کر گُم مجُھ کو

ہمہ حسرت ہوں سراپا غمِ بربادی ہُوں

ستمِ دہر کا مارا ہُوا فریادی ہوں

اے کہ تھا نُوحؑ کو طوفاں میں سہارا تیرا

اور براہیمؑ کو آتش میں بھروسا تیرا

اے کہ مشعل تھا ترا ظلمُتِ عالم میں وجُود

اور نورِ نگہِ عرش تھا سایا تیرا

اے کہ پرتو ہے ترے ہاتھ کا مہتاب کا نُور

چاند بھی چاند بنا پاکے اشارا تیرا

گرچہ پوشیدہ رہا حُسن ترا پردوں میں

ہے عیاں معنئ لولاک سے پایا تیرا

ناز تھا حضرت موسیٰؑ کو یدِ بیضا پر

سو تجلّی کا محل نقشِ کفِ پا تیرا

چشم ہستی صفتِ دیدۂ اعمٰی ہوتی

دیدۂ کُن میں اگر نور نہ ہوتا تیرا

مُجھ کو انکار نہیں آمدِ مہدی سے مگر

غیر ممکن ہے کوئی مثل ہو پیدا تیرا

کیا کھوں اُمّت مرحوم کی حالت کیا ہے

جس سے برباد ہوئے ہم وہ مصیبت کیا ہے

حالِ امّت کا بُرا ہو کہ بھلا کہتے ہیں
صفتِ آئینہ جو کچھ ہے صفا کہتے ہیں

واعظوں میں یہ تکبّر کہ الٰہی توبہ
اپنی ہر بات کو آوازِ خدا کہتے ہیں

ان کے ہر کام میں دنیا طلبی کا سودا
ہاں مگر وعظ میں دُنیا کو بُرا کہتے ہیں

غیر بھی ہو تو اسے چاہیئے اچّھا کہنا
پر غضب ہے کہ یہ اپنوں کو بُرا کہتے ہیں

فرقہ بندی کی ہَوا تیرے گلستاں میں چلی
یہ وُہ ناداں ہیں اسے بادِ صبا کہتے ہیں

آہ جس بات سے ہو فتنۂ محشر برپا
یہ وہ بندے ہیں اسے فتنہ رُبا کہتے ہیں

جن کی دینداری میں ہے آرزوئے زر پنہاں

آکے دھوکے میں انھیں راہ نما کہتے ہیں

لاکھ اقوام کو دُنیا میں اُجاڑا اس نے

یہ تعصّب کو مگر گھر کا دِیا کہتے ہیں

خانہ جنگی کو سمجھتے ہیں بنائے ایماں

مرض الموت ہے جو اس کو دوا کہتے ہیں

مقصدِ لکُمْ دِینُکُم لِیَ دِینِ پہ کھلی ان کی زباں

یہ تو اِک راہ سے تُجھ کو بھی بُرا کہتے ہیں

تیرے پیاروں کا جو یہ حال ہو اَے شافعِ حشر

میرے جیسوں کو تو کیا جانئے کیا کہتے ہیں

بُغض للّٰلہ کے پردے میں عداوت ذاتی

دین کی آڑ میں کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں

جن کا یہ دیں ہو کہ اپنوں سے کریں ترکِ سلام
ایسے بندوں کو یہ بندۂ "صلحا" کہتے ہیں

قوم کے عشق میں ہو فکرِ کفن بھی نہ جسے
یہ اُسے بندۂ بے دامِ ہَوا کہتے ہیں

وصل ہو لیلئِ مقصود سے کیونکر اپنا
اخترِ سوختۂ قیس ہے اختر اپنا

امرا جو ہیں وُہ سُنتے نہیں اپنا کہنا
سامنے تیرے پڑا ہے مجھے کیا کیا کہنا

ہم جو خاموش تھے اب تک تو ادب مانع تھا
ورنہ آتا تھا ہمیں حرفِ تمنّا کہنا

دردمندوں کا کہیں حال چھُپا رہتا ہے؟
اپنی خاموشی بھی تھی ایک طرح کا کہنا

شکوہ منّت کشِ لب ہے کبھی منّت کشِ چشم
میرا کہنا جو ہے رونا تو ہے رونا کہنا

قوم کو قوم بنا سکتے ہیں دولت والے
یہ اگر راہ پہ آجائیں تو پھر کیا کہنا

بادۂ عیش میں سرمست رہا کرتے ہیں
یاد فرمان نہ تیرا نہ خدا کا کہنا

ہم نے سَو بار کہا "قوم کی حالت ہے بُری"
پر سمجھتے نہیں یہ لوگ ہمارا کہنا

دیکھتے ہیں یہ غریبوں کو تو برہم ہوکر
فقر تھا فخر ترا شاہِ دوعالم ہوکر

اِس مصیبت میں ہے اِک تُو ہی سہارا اپنا
تنگ آکر لبِ فریاد ہُوا وا اپنا

ایسی حالت میں بھی امید نہ ٹوٹی اپنی

نام لیوا ہیں ترے تجھ پہ ہے دعوے اپنا

فرقہ بندی سے کیا راہ نماؤں نے خراب

ہائے اِن مالیوں نے باغ اُجاڑا اپنا

ہم نے سو راہ اخوّت کی نکالی لیکن

نہ تو اپنا ہوُا اپنا نہ پرایا اپنا

دیکھ اے نوُحؑ کی کشتی کے بچانے والے

آیا گردابِ حوادث میں سفینا اپنا

اس مصیبت میں اگر تُو بھی ہماری نہ سُنے

اور ہم کِس سے کہیں جا کے فسانا اپنا

ہاں برس ابرِ کرم دیر نہیں ہے اچھّی

کہ نہ ہونے کے برابر ہوُا ہونا اپنا

لطف یہ ہے کہ پھلے قوم کی کھیتی اس سے
ورنہ ہونے کو تو آنسو بھی ہے دریا اپنا

اب جو ہے ابرِ مصیبت کا دُھواں دھار آیا
ڈھونڈتا پھرتا ہے تُجھ کو دلِ شیدا اپنا

یوں تو پوشیدہ نہ تھی تجھ سے ہماری حالت
ہم نے گھبرا کے مگر تذکرہ چھیڑا اپنا

زندگی تجھ سے ہے اے فخرِ براہیم اپنی
کر دُعا حق سے کہ مشکل ہُوا جینا اپنا

ایک یہ بزم ہے لے دے کے ہماری باقی
ہے انہی لوگوں کی ہمّت پہ بھروسا اپنا

داستاں درد کی لمبی ہے کہیں کیا تُجھ سے
ہے ضعیفوں کو سہارے کی تمنّا تجھ سے

قوم کو جس سے شفا ہو وُہ دوا کون سی ہے

یہ چمن جس سے ہرا ہو وُہ صبا کون سی ہے

جس کی تاثیر سے ہو عزّتِ دین و دُنیا

ہائے اَے شافعِ محشرؐ وُہ دُعا کون سی ہے

جس کی تاثیر سے یک جان ہو اُمّت ساری

ہاں بتا دے ہمیں وُہ طرزِ وفا کون سی ہے

جس کے ہر قطرہ میں تاثیر ہو یک رنگی کی

ہاں بتا دے وُہ مئے ہوش رُبا کون سی ہے

قافلہ جس سے رواں ہو سُوئے منزل اپنا

ناقہ وُہ کیا ہے وُہ آوازِ درا کون سی ہے

اپنی فریاد میں تاثیر نہیں ہے باقی

جس سے دِل قوم کا پِگھلے وُہ صدا کون سی ہے

سب کو دولت کا بھروسا ہے زمانے میں مگر

اپنی اُمید یہاں تیرے سوا کون سی ہے

اپنی کھیتی ہے اُجڑ جانے کو اے ابرِ کرم

تجھ کو جو کھینچ کے لائے وُہ ہوا کون سی ہے

ہے نہاں جن کی گدائی میں امیری سب کی

آج دُنیا میں وُہ بزمِ فقرا کون سی ہے

تیرے قرباں کہ دکھا دی ہے یہ محفل تُو نے

مَیں نے پُوچھا جو اخوّت کی بنا کون سی ہے

راہ اس محفلِ رنگیں کی دِکھا دے سب کو

اور اس بزم کا دیوانہ بنا دے سب کو

خطِ منظوم

"پیغامِ بیعت کے جواب میں"

اِس نظم کا دُوسرا بند کسی قدر ترمیم کے ساتھ "بانگِ درا" میں "عقل و دل" کے عنوان سے موجود ہے۔ پوری نظم اربابِ ذوق کی دلچسپی کیلئے ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

خضر سے چُھپ کے مر رہا ہُوں میں — تشنہ کامِ مئے فنا ہوں مَیں
ہم کلامی ہے غیریت کی دلیل — خامشی پر مٹا ہُوا ہُوں مَیں
کانپ اُٹھتا ہُوں ذکرِ مرہم پر — وُہ دلِ درد آشنا ہُوں مَیں
تنکے چُن چُن کے باغِ اُلفت کے — آشیانہ بنا رہا ہُوں میں
گُل پژمُردۂ چمن ہُوں مگر — رونقِ خانۂ صبا ہُوں مَیں
کارواں سے نکل گیا آگے — مثلِ آوازۂ درا ہُوں مَیں

دستِ واعظ سے آج بن کے نماز
کس ادا سے قضا ہوا ہوں مَیں

مجھ سے بیزار ہے دلِ زاہد
دیدۂ حور کی حیا ہوں مَیں

ہے زباں مائل ترانۂ شوق
سُننے والے کو دیکھتا ہوں مَیں

مَیں نے مانا کہ بے عمل ہوں مگر
رمزِ وحدت سے آشنا ہوں مَیں

پردۂ سیم میں رہے کوئی
اس بُھلاوے کو جانتا ہوں مَیں

سب کسی کا کرم ہے یہ ورنہ
کیا مِرا شوق اور کیا ہوں مَیں

مَیں کسی کو بُرا کہوں، توبہ
ساری دُنیا سے خود بُرا ہوں مَیں

جام ٹُوٹا ہوا ہوں مَیں لیکن
مئے حق سے بھرا ہوا ہوں مَیں

ایک دانے پہ ہے نظر تیری
اور خرمن کو دیکھتا ہوں مَیں

تو جُدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں مَیں

بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اِس عبادت کو کیا سراہوں مَیں

بُت پرستی تو ایک مذہب ہے
کُفرِ غفلت کو جانتا ہوں مَیں

مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے　　اور آنسو بہا رہا ہوں میں
میرے رونے پہ ہنس رہا ہے تو　　تیرے ہنسنے کو رو رہا ہوں میں

عقل نے ایکدن یہ دل سے کہا　　بھولے بھٹکوں کی رہنما ہوں میں
ہوں زمیں پر، گذر فلک پہ مرا　　دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
علم پلتا ہے میری گودی میں　　رازِ ہستی سے آشنا ہوں میں
رہبری دہر میں ہے کام مرا　　رشکِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسّر کتابِ ہستی کی　　مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں
تو مری ہمسری کرے توبہ　　دیدۂ کور کی ضیا ہوں میں
بوند اک خون کی ہے تو لیکن　　غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں
دل نے سن کر کہا کہ سب سچ ہے　　پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں
رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے　　اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
میرے دم سے جہان بستا ہے　　اِس اندھیرے میں چاندنا ہوں میں

ہے تُجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن کو دیکھتا ہُوں مَیں

علم تُجھ سے تو معرفت مُجھ سے — تو خُدا جُو۔ خُدا نما ہوں مَیں

علم کی انتہا ہے بے تابی — اِس مرض کی مگر دوا ہُوں مَیں

شمع تو محفلِ صداقت کی — حُسن کی بزم کا دیا ہُوں مَیں

کس بلندی پہ ہے مقام مرا — عرش ربِّ جلیل کا ہُوں مَیں

گلشنِ طور میں بہار مری — قطرۂ بحرِ آشنا ہُوں مَیں

تُو ہے وابستۂ زمان و مکان — اور اس قید سے رہا ہُوں مَیں

ہائے یہ دِل ہو میرے پہلُو میں — تو یہ سمجھے کہ دھریا ہوں مَیں

اہلِ دِل کو بگاڑ سے مطلب — سب بزرگوں کی خاکِ پا ہُوں مَیں

فیض اقبال ہے اِسی در کا
بندۂ شاہِ لافتےٰ ہُوں مَیں

(مخزن۔ بابت مئی ۱۹۰۲ء)

"ماتمِ پسر"

ہمارے ایک عنایت فرما رئیس بارہ مولا علاقہ کشمیر خواجہ صمد جو ککڑو ہیں۔ انہیں چند ماہ ہوئے اپنے چہیتے اور ہونہار بیٹے کی مرگِ ناگہاں کا داغ دیکھنا نصیب ہوا۔ خواجہ صاحب ذی علم اور علم دوست رئیس ہیں اور خود زبانِ فارسی میں طبّاع شاعر ہیں اور مقبلؔ تخلص کرتے ہیں۔ مگر اس رنج نے ان کی طباعی اور زندہ دلی پر پانی پھیر دیا ہے۔ اور انہیں تصویرِ غم بنا دیا ہے۔ شیخ محمد اقبالؔ صاحب نے انکی طرف سے مرحوم کا نوحہ لکھا ہے جو درج ذیل ہے۔ (مخزن۔ جولائی ۱۹۰۲ء)

اندھیرا صمؔد کا مکاں ہوگیا　　وہ خورشیدِ روشن نہاں ہوگیا

بیاباں ہماری سرا بن گئی　　مسافر وطن کو رواں ہوگیا

گیا اُڑ کے وہ بلبلِ خوش نوا　　چمن پائمالِ خزاں ہوگیا

نہیں باغِ کشمیر میں وہ بہار　　نظر سے جو وہ گل نہاں ہوگیا

گیا کارواں اور میں راہ میں　　غبارِ رہِ کارواں ہوگیا

گرا کٹ کے آنکھوں سے لختِ جگر — مرے صبر کا امتحاں ہو گیا

بڑھا اور اِک دشمنِ جاں ستاں — دُھواں آہ کا آسماں ہو گیا

ستم اس غضب کا خزاں نے کیا — بیاباں مرا بوستاں ہو گیا

ہوئی غم کی عادت کچھ ایسی مجھے — کہ غم مجھ کو آرامِ جاں ہو گیا

کسی نوجواں کی جُدائی میں قد — جوانی میں مثلِ کماں ہو گیا

جُدائی میں نالاں ہوں بُلبل نہ کیوں — وُہ گُل زیبِ باغِ جناں ہو گیا

وُہ سُرخی ہے اشکِ شفق رنگ میں — حریفِ مئے ارغواں ہو گیا

بنایا تھا ڈر ڈر کے جو آشیاں — وُہی نذرِ برقِ تپاں ہو گیا

کروں ضبط اے ہمنشیں کس طرح — کہ ہر اشک طُوفاں نشاں ہو گیا

غضب ہے غلامِ حسن کا فراق — کہ جینا بھی مُجھ کو گراں ہو گیا

دیا چُن کے وُہ غم فلک نے اسے
کہ مقبلؔ سراپا فغاں ہو گیا

برگِ گل

بر مزارِ مبارک حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ دہلوی

اقبال اپنے ایک خط مؤرخہ ۶ راگست ۱۹۰۳ء میں مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کو لکھتے ہیں :-

" میرے بڑے بھائی جان (شیخ عطا محمدؒ) پر جو بلوچستان کی سرحد پر سب ڈویژنل آفیسر ملٹری ورکس تھے ، ان کے مخالفین نے ایک خوفناک فوجداری مقدمہ بنا دیا تھا۔ لیکن الحمد للہ کہ دشمنوں کے منہ میں خاک پڑی ، بھائی صاحب بَری ہوئے۔ اگرچہ روپیہ کثیر صرف ہوا۔ تاہم شکر ہے ہماری مصیبت کا خاتمہ ہوا۔ ہم باقی رہ گئے اور ہماری مصیبت دشمنوں کی تلاش میں پھر بلوچستان کی طرف عود کر گئی۔ بلوچستان ایجنسی والے تو ہمارے ساتھ ناانصافی پہ آمادہ تھے ۔ مگر خدا لارڈ کرزن کا بھلا

کرے کہ میرے لکھنے پر معاملہ دگرگوں ہوگیا۔"

ابتلا کے اسی دور میں اقبالؔ نے یہ نظم لکھ کر خواجہ حسن نظامی کے پاس بھیجی

کہ حضرت محبوب الٰہی قدس سرّہٗ کے مزار پر پڑھی جائے اس کا ایک شعر ؎

ہند کا داتا ہے تُو تیرا بڑا دربار ہے

کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربارِ گوہر بار سے

علیحدہ لکھ کر مزار شریف کے دروازے پر لگایا گیا۔ نظم ستمبر ۱۹۰۳ء کے "مخزن" میں

شائع ہوئی تھی۔

کیوں نہ ہوں ارماں مرے دل میں کلیم اللہ کے

طُور در آغوش ہیں ذرّے تری درگاہ کے

میَں تری درگاہ کی جانب جو نکلا لے اُڑا

آسماں تارے بنا کر میری گردِ راہ کے

ہے زیارت کی تمنّا، المدد اے سوزِ عشق

پھُول لا دے مجھ کو گلزار خلیل اللہ کے

شانِ محبُوبی ہوئی ہے پردہ دارِ شانِ عشق

واہ کیا رُتبے ہیں اس سرکارِ عالی جاہ کے

تر جو تیرے آستانے کی تمنّا میں ہُوئی

اشک موتی بن گئے چشمِ تماشا خواہ کے

رنگ اس درگہ کے ہر ذرّے میں ہے توحید کا

طائرانِ بام بھی طائر ہیں بسم اللہ کے

چھُپ کے ہے بیٹھا ہُوا اثباتِ نفیِ غیر میں

لا کے دریا میں نہاں موتی ہیں اِلّا اللہ کے

سنگِ اسود تھا مگر سنگِ فسانِ تیغِ عشق

زخم میرے کیا ہیں دروازے ہیں بیت اللہ کے

عشق اس کو بھی تری درگاہ کی رفعت سے ہے

آہ! یہ انجم نہیں آنسو ہیں چشمِ ماہ کے

کس قدر سرسبز ہے صحرا محبّت کا مری

اشک کی نہریں ہیں اور سائے ہیں نخلِ آہ کے

تیرے ناخن نے جو کھولی میمِ احمدؐ کی گرہ

کھُل گئے عقدے جہاں میں ہر خُدا آگاہ کے

میرے جیسے بے نواؤں کا بھلا مذکور کیا

قیصر و فغفور ہیں درباں تری درگاہ کے

محوِ اظہارِ تمنّائے دلِ ناکام ہُوں

لاج رکھ لینا کہ مَیں اقبالؔ کا ہم نام ہُوں[1]

سہمی پھرتی ہے شفا میرے دلِ بیمار سے

اے مسیحا دم! بچا لے مجھ کو اِس آزار سے

---

[1] خواجہ محمد اقبال حضرت کے ایک مُریدِ خاص کا نام تھا۔ جن پر ان کی بڑی نظرِ عنایت تھی۔

اے ضیائے چشمِ عرفاں، اے چراغِ راہِ عشق

تنگ آیا ہوں جفائے چرخِ ناہنجار سے

سینۂ پاکِ علیؑ جن کا امانت دار تھا

اے شہِ ذی جاہ! تو واقف ہے اُن اسرار سے

ہند کا داتا ہے تُو تیرا بڑا دربار ہے

کُچھ ملے مُجھ کو بھی اِس دربار گوہر بار سے

اِک نظر میں خسروِ مُلکِ سخن خسرو ہوا

مَیں کہیں خالی نہ پھر جاؤں تری سرکار سے

تاک میں بیٹھی ہے بجلی میرے حاصل کے لئے

بَیر ہے بادِ بہاری کو مرے گُلزار سے

آج کل اصغر جو تھے اکبر ہیں اور مولا غُلام

ہیں مُجھے شکوے ہزاروں چرخِ کج رفتار سے

کیا کروں اَوروں کا شکوہ، اے امیرِ ملکِ فقر!

دُشمنی میں بڑھ گئے اہلِ وطن اغیار سے

کہہ رہے ہیں مجھ کو پربستہ قفس میں دیکھکر

اُڑ نہ جائے یہ کہیں پَر کھول کر منقار سے

گریۂ شبنم پہ گُل ہنستے ہیں کیا بے درد ہیں

وُہ جو تھی بُوئے محبّت اُڑ گئی گُلزار سے

گھات میں صیّاد، مائل آشیاں سوزی پہ برق

باغ بھی بگڑا ہوُا ہے عندلیبِ زار سے

کہہ دیا تنگ آ کے اتنا بھی کہ مَیں مجبُور تھا

خامشی ممکن نہیں خُو کردۂ گفتار سے

ہاں قسم دیتا ہُوں مَیں مدفونِ یثرب کی تجُھے

کر دُعا حق سے کہ مَیں چُھٹ جاؤں اس آزار سے

سخت ہے میری مصیبت سخت گھبرایا ہُوں مَیں
بن کے فریادی تری سرکار میں آیا ہُوں مَیں

کیمیا سے بھی فزوں ہے تیری خاکِ در مُجھے
ہاں عطا کر دے مرے مقصود کا گوہر مُجھے

تُو ہے محبوبِ الٰہی کر دُعا میرے لئے
یہ مُصیبت ہے مثالِ فتنۂ محشر مُجھے

آہ اِس غم میں اگر تُو نے خبر میری نہ لی
غرق کر ڈالے گی آخر کو یہ چشمِ تر مُجھے

ہو اگر یُوسف مرا زحمت کشِ چاہِ الم
چَین آئے مصرِ آزادی میں پھر کیونکر مُجھے

آپ یہ وقفِ تپش ہم صورتِ سیماب ہے
کیا تسلّی دے بھلا میرا دلِ مضطر مُجھے

کیا کہوں مَیں قصّۂ ہمدردیٔ اہلِ وطن
تیر کوئی بھیجتا ہے اور کوئی نشتر مُجھے
یہ خوشی پھیلی مرے غم سے کہ شادی مرگ ہیں
زندگانی ہو گئی ہے موت سے بدتر مُجھے
اُس بڑی سرکار کے قابل مری فریاد ہے
چل حضوری میں شہِ یثرب کی تو لے کر مُجھے
میرا کیا منہ ہے کہ اُس سرکار میں جاؤں مگر
تیرے جیسا مل گیا تقدیر سے رہبر مُجھے
واسطہ دُوں گا اگر لختِ دلِ زہرا کا مَیں
غم میں کیونکر چھوڑ دیں گے شافعِ محشر مُجھے
ہُوں مریدِ خاندانِ شفقتۂ خاکِ نجف
موجِ دریا آپ لے جائے گی ساحل پر مُجھے

روتے والا ہُوں شہیدِ کربلا کے غم میں مَیں
کیا دُرِ مقصد نہ دیں گے ساقیٔ کوثر مجھے

دِل میں ہے مجھ بے عمل کے داغِ عشقِ اہلبیتؑ
ڈھونڈتا پھرتا ہے ظلِّ دامنِ حیدرؑ مجھے

جا ہی پہنچے گی صدا پنجاب سے دہلی تلک
کر دیا ہے گرچہ اس غم نے بہت لاغر مجھے

آہ! تیرے سامنے آنے کے ناقابل ہُوں مَیں
منہ چھپا کر مانگتا ہُوں تجھ سے وُہ سائل ہُوں میں

شیشۂ ساعت کی ریگ

اے مُشتِ گردِ میداں، اے ریگِ سُرخ صحرا
کس فتنہ خُو نے تجھ سے دشتِ عرب چُھڑایا
صرصر کے دوش پر تُو اُڑتی پھری ہے صدیوں
بلّور کے مکاں میں کرتی ہے اب بسیرا
ہے خار زارِ غُربت تیرے لئے یہ شیشہ
قصرِ بلور جس کو میری نظر نے سمجھا
تیرے سکوت میں ہے سَو داستاں پُرانی
عہدِ کُہن بھی گویا دیکھا ہُوا ہے تیرا
اس دن کی یاد ابتک باقی ہے تیرے دِل میں

کنعاں کا قافلہ جب سُوئے حجاز آیا

دیکھے ہوئے ہیں تیرے فرعون کے سپاہی

تو ہو چکی ہے شاید پامال قومِ مُوسٰؑ سے

چُومے تھے تُو نے اُڑ کر مریمؑ کے پائے نازک

ٹُوٹا جو ناصرہ کی تقدیر کا ستارا

شاید گواہ ہے تو اُس روز کے ستم پر

یثرب کا چاند جس دم اپنے وطن سے نکلا

ہو کس طرح بھلا تو اِس نقشِ پا سے غافل

جس نے ترے وطن کو جنّت بنا دیا تھا

اے ریگِ سُرخ تیرا ہر ذرّہ کہہ رہا ہے

مَیں جانتا ہُوں قصّہ میدانِ کربلا کا

تُو گردِ پا ہے شاید بصرہ کے زائروں کی

بانگ درا سے تیرا ہر ذرّہ ہے شناسا

طرزِ نفس شماری شیشے سے تو نے سیکھی

جاسوس بن گئی تو اقلیمِ زندگی کی

خدنگِ نظر

ماہ ستمبر ۱۹۰۳ء

دربارِ بہاولپور

ماہ رواں میں چند روز سرزمینِ بہاول پور نے ایسے دیکھے ہیں جن پر وہ تا دیر

ناز کرے گی۔ رعایائے بہاول پور کی مخلصانہ دعائیں کامیاب ہوئیں نخلِ تمنّا

ہرا ہوا۔ اور شاخِ آرزو پھل لائی۔ یعنی حضور پر نور رکن الدّولہ۔ نصرت جنگ

مخلص الدّولہ۔ حافظ الملک ہز ہائینس نواب محمّد بہاول خان پنجم عبّاسی کو ہز ایکسلینسی

وائسرائے و گورنر جنرل بہادر کشورِ ہند نے خود اپنے ہاتھوں سے مسندِ سلطنت

پر بٹھایا اور زمام اختیارات ان کے ہاتھ میں دی۔ اس خوشی کی تقریب میں

جو جشن ریاست میں منایا گیا وہ مدّتوں یادگار رہے گا۔ زمینِ بہاول پور ۲۱ر

نومبر کی شام کو کثرتِ چراغاں سے رشکِ آسماں بن رہی تھی۔ اور سارا شہر

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک سجی ہوئی دُلہن۔ ہجومِ خلائق ایسا کہ معلوم ہو

آبادی کہیں گرد و نواح میں باقی ہی نہیں رہی سب کھنچ کر بہاول پور میں آ گئی ہے۔ رؤسائے عالی تبار اور راجگانِ ذیشان کے علاوہ دیگر معزّز مہمان جو ہر فرقے اور ہر طبقے کے منتخب لوگوں میں تھے اور ملک کے ہر گوشے سے آئے ہوئے تھے زینتِ تقریب کو دوبالا کر رہے تھے۔ انگریزی حکّام کی بھی ایک معقول تعداد رونق بخشِ جلسہ تھی۔ اس مبارک تقریب پر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے سے ایک قصیدہ کہنے کی فرمائش کی گئی تھی اور انھیں مدعو بھی کیا گیا تھا۔ مگر فرضِ منصبی سے رخصت نہ ملنے کی وجہ سے وہ جانے سے معذور رہے اور قلّتِ فرصت سے قصیدہ بھی بعد میں مکمّل ہوا۔ اس لئے ہم اُسے ان ناچیز اوراق کے ذریعہ سے بندگانِ عالی تک پہنچاتے ہیں۔ صاحبانِ فن دیکھیں گے کہ قصیدہ کی زمین کس قدر مشکل تھی۔ مگر اس میں کیسے کیسے شعر طبعِ خداداد کے زور سے شاعر نے نکالے ہیں اور پُرانے اور نئے رنگ کو کس خوبی سے ملایا ہے۔ چونکہ

اب کے حصّۂ نظم پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اور ادھر نثر میں چند صفحوں کی گنجائش ہے۔ اور اس قصیدہ کا اسی مہینے شائع ہونا موزوں معلوم ہوتا ہے اس لئے نثر کے حصّے میں اس قصیدہ کو جگہ دیتے ہیں۔

عبدالقادر

بزمِ انجم میں ہے گو چھوٹا سا اِک اختر زمیں
آج رفعت میں ثریّا سے بھی ہے اُوپر زمیں
اوج میں بالا فلک سے مہر سے تنویر میں
کیا نصیبہ ہے رہی ہر معرکہ میں درزمیں
انتہائے نُور سے ہر ذرّہ اختر خیز ہے
مہر و ماہ و مشتری صیغے ہیں اور مصدر زمیں
لے کے پیغامِ طرب جاتی ہے سُوئے آسماں
اب نہ ٹھہرے گی کبھی اطلس کے شانوں پر زمیں

شوق بک جانے کا ہے فیروزۂ گردوں کو بھی

مول لیتی ہے لُٹانے کے لئے گوہر زمیں

بس کہ گُلشن ریز ہے ہر قطرۂ ابرِ بہار

ہے شگفتہ صورتِ طبعِ سخن گستر زمیں

برگِ گل کی رگ میں ہے جنبش رگِ جاں کی طرح

ہے امیں اعجازِ عیسےٰ کی کہ افسوں گر زمیں

خاک پر کھینچیں جو نقشہ مُرغِ بسم اللّٰہ کا

قوّتِ پروانہ دے دے حرفِ قُم کہہ کر زمیں

صاف آتا ہے نظر صحنِ چمن میں عکسِ گُل

بن گئی آپ اپنے آئینے کی روشن گر زمیں

اس قدر نظّارہ پرور ہے کہ نرگس کے عوض

خاک سے کرتی ہے پیدا چشمِ اسکندر زمیں

امتحاں ہو اس کی وسعت کا جو مقصودِ چمن
خواب میں سبزے کے آئے آسماں بن کر زمیں

چاندنی کے پھول پر ہے ماہِ کامل کا سماں
دن کو ہے اوڑھے ہوئے مہتاب کی چادر زمیں

آسماں کہتا ہے ظلمت کا جو ہو دامن میں داغ
دھووے پانی چشمۂ خورشید سے لے کر زمین

چومتی ہے دیکھنا جوشِ عقیدت کا کمال
پائے تختِ یادگارِ عمِّ پیغمبر زمیں

زینتِ مسند ہوا عبّاسیوں کا آفتاب
ہو گئی آزاد احسانِ شہ خاور زمیں

یعنی نواب بہاول خاں۔ کرے جس پر فدا
بحر موتی، آسماں انجم، زر و گوہر زمیں

جس کے بدخواہوں کی شمعِ آرزُو کے واسطے
رکھتی ہے آغوش میں صد موجۂ صرصر زمیں

جس کی بزمِ مسند آرائی کے نظّارے کو آج
دِل کے آئینہ سے لائی دیدۂ جوہر زمیں

فیضِ نقشِ پا سے جس کے ہے وہ جاں بخشی کا ذوق
شمع سے لیتی ہے پروانے کی خاکستر زمیں

جس کی راہِ آستاں کو حق نے وُہ رُتبہ دیا
کہکشاں اس کو سمجھتا ہے فلک محور زمیں

آستانہ جس کا ہے اس قوم کی امید گاہ
تھی کبھی جس قوم کے آگے جبیں گستر زمیں

جس کے فیضِ پا سے ہے شفّاف مثلِ آئینہ
چشمِ اعدا میں چھپا کر خاک کا عنصر زمیں

جس کے ثانی کو نہ دیکھے مُدّتوں ڈھونڈے اگر

ہاتھ میں لے کر چراغِ لالۂ احمر زمیں

وُہ سراپا نُور اک مطلع خطابیّہ پڑھوں

جس کے ہر مصرع کو سمجھے مطلع خاور زمین

اَے کہ فیضِ نقشِ پا سے تیرے گُل بر سر زمیں

اے کہ تیرے دم قدم سے خسروِ خاور زمیں

اے کہ تیرے آستاں سے آسماں انجم بجیب

اے کہ ہے تیرے کرم سے معدنِ گوہر زمیں

لے کے آئی ہے برائے خطبۂ نامِ سعید

چوبِ نخلِ طُور سے ترشا ہُوا منبر زمیں

تیری رفعت سے جو یہ حیرت میں ہے ڈُوبا ہُوا

جانتی ہے مہر کو اِک مہرۂ ششدر زمیں

ہے سراپا طُور عکسِ رائے روشن سے ترے

ورنہ تھی بے نُور مثلِ دیدۂ عبہر زمیں

مایۂ نازش ہے تُو اُس خانداں کے واسطے

اب تلک رکھتی ہے جس کی داستاں از بر زمیں

ہو ترا عہد مبارک صُبحِ حکمت کی نمُود

وُہ چمک پائے کہ ہو محسودِ ہر اختر زمیں

سامنے آنکھوں کے پھر جائے سماں بغداد کا

ہند میں پیدا ہو پھر عبّاسیوں کی سرزمیں

محو کر دے عدل تیرا آسماں کی کج روی

کلّیاتِ دہر کے حق میں بنے مسطر زمیں

صُلح ہو ایسی گلے مل جائیں ناقوس و اذاں

ساتھ مسجد کے رکھے بُت خانۂ آذر زمیں

نامِ شاہنشاہ اکبر زندۂ جاوید ہے

ورنہ دامن میں لئے بیٹھی ہے سَو قیصر زمیں

بادشاہوں کی عبادت ہے رعیّت پروری

ہے اِسی اخلاص کے سجدے سے قائم ہر زمیں

ہے مروّت کی صدف میں گوہرِ تسخیرِ دل

یہ گہر وُہ ہے کرے جس پر فدا کشور زمیں

حکمراں مستِ شرابِ عیش و عشرت ہو اگر

آسماں کی طرح ہوتی ہے ستم پرور زمیں

عدل ہو مالی اگر اُس کا یہی فردوس ہے

ورنہ ہے مٹّی کا ڈھیلا خاک کا پیکر زمیں

ہے گل و گلزارِ محنت کے عرق سے سلطنت

ہو نہ یہ پانی تو پھر سرسبز ہو کیوں کر زمیں

چاہیئے پہرا دماغِ عاقبت اندیش کا

بے دری میں ہے مثالِ گنبدِ اخضر زمیں

لامکاں تک کیوں نہ جائے گی دُعا اقبال کی

عرش تک پہنچی ہے جس کے شعر کی اُڑ کر زمیں

خانداں تیرا رہے زیبندۂ تاج و سریر

جب تک مثلِ قمر کھاتی رہے چکّر زمیں

مسندِ احباب رفعت سے ثریّا بوس ہو

خاک رختِ خواب ہو اعدار کا اور بستر زمیں

تیرے دشمن کو اگر شوقِ گُل و گلزار ہو

باغ میں سبزے کی جا پیدا کرے نشتر زمیں

ہو اگر پنہاں تری ہیبت سے ڈر کر زیرِ خاک

مانگ کر لائے شعاعِ مہر سے خنجر زمیں

پاک ہے گردِ غرض سے آئینہ اشعار کا

جو فلک رفعت میں ہو لایا ہوں وہ چن کر زمیں

تھی تو پتّھر ہی مگر مدحت سرا کے واسطے

ہو گئی ہے گُل کی پتّی سے بھی نازک تر زمیں

(مخزن - نومبر ۱۹۰۳ء)

سپاس جنابِ امیرؑ

ذیل کی نظم درج کر کے آج ہم ان احباب کے تقاضوں سے سبکدوش ہوتے ہیں جو پروفیسر اقبالؔ صاحب کے فارسی کلام کے لیئے اکثر دفعہ اشتیاق ظاہر کیا کرتے ہیں۔ فارسی نظمیں عموماً مخزن میں درج نہیں ہوتیں۔ تاہم احباب کے اصرار سے ہم اسے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ یہی نظم باظہار عقیدت شیخ صاحب صبح کے وقت پڑھا کرتے ہیں۔

(مخزن، جنوری ۱۹۰۵ء)

اے محوِ ثنائے تو زباں ہا — اے یوسفِ کاروانِ جانہا

اے بابِ مدینۂ محبّت — اے نوحِ سفینۂ محبّت

اے ماحیِ نقشِ باطلِ من — اے فاتحِ خیبرِ دلِ من

اے سرِّ خطِ وجوب و امکاں　　تفسیرِ تو سورہ ہائے قرآں

اے مذہب عشق را نمازے　　اے سینۂ تو امین رازے

اے سرِّ نبوّتِ محمدؐ　　اے وصفِ تو مدحتِ محمدؐ

گردوں کہ بہ رفعت ایستادست　　از بامِ بلندِ تو فتادست

ہر ذرّہ در گہت چو منصور　　در جوشِ ترانۂ انا الطور

بے تو نتواں باو رسیدن　　بے او نتواں بتو رسیدن

فردوس نہ تو چمن در آغوش　　از شانِ تو حیرت آئنہ پوش

جانم بغلامیٔ تو خوشتر　　سر بر زدہ ام ز جیب قنبرؓ

ہشیارم و مست بادۂ تو　　چوں سایہ زپا فتادۂ تو

از ہوش شدم مگر بہوشم　　گوئی کہ نصیری خموشم

دانم کہ ادب بضبط راز است　　در پردۂ خامشی نیاز است

امّا چہ کنم سے تولا　　تنداست بروں فتد ز مینہا

زاندیشۂ عاقبت رہیدم

جنسِ غمِ آلِ تو خریدم

فکرم چو بہ جُستجو قدم زد — در دیر شُد و درِ حرم زد

در دشتِ طلب بسے دویدم — دامان چو گرد باد چیدم

در آبلہ خارہا خلیدہ — صد لالہ تہِ قدم دمیدہ

افتادہ گرہ بروے کارم — شرمندۂ دامنِ غبارم

پویاں پئے خضر سوئے منزل — بر دوشِ خیال بستہ محمل

جویائے مے و شکستہ جامے — چوں صبح بباد چیدہ دامے

پیچیدہ بخود چو موجِ دریا — آوارہ چو گرد بادِ صحرا

واماندہ ز دردِ نارسیدن — در آبلۂ شکستہ دامن

عشقِ تو دلم ربود ناگاہ — از کارِ گرہ کشود ناگاہ

آگاہ زہستی و عدم ساخت — بُت خانۂ عقل را حرم ساخت

چوں برق بخرمنم گزر کرد | از لذّتِ سوختن خبر کرد
برباد متاعِ ہستیم داد | جامے ز مئے حقیقتم داد
سرمست شدم ز پا فتادم | چوں عکس ز خود جدا فتادم
پیراہنِ ما و من دریدم | چوں اشک ز چشمِ خود چکیدم
خاکم بفراز عرش بردی | زاں راز کہ با دِلم سپردی
واصل بکنار کشتیم شد | طوفانِ جمال زشتیم شد
جُز عشق حکایتے ندارم | پروائے ملامتے ندارم

از جلوۂ عام بے نیازم
سوزم - گریم - تپم - گدازم

(مخزن - جنوری ۱۹۰۵ء)

ترجمہ از ڈائک

دل شمع صفت عشق سے ہو نور سراپا

اور فکر یہ روشن ہو کہ آئینہ ہو گویا

نیکی ہو ہر اک فعل کی نیت سے ہویدا

ہر حال میں ہو خالقِ ہستی پہ بھروسا

ایسی کوئی نعمت تہ افلاک نہیں ہے

یہ بات جو حاصل ہو تو کچھ باک نہیں ہے

(مخزن ۱۹۰۴ء)

ابر

نمودِ ابر سے ہشیار ہو گیا سبزہ
اِسی کے ہجر میں گویا اُداس تھا سبزہ

ہَوا کے نم سے ہوئی نرم سرو کی ٹہنی
جو آ کے فاختہ بیٹھی تو جُھک گئی ٹہنی

ہلا رہی ہے سرِ شاخ گُل کو موجِ ہَوا
بنا ہے باغ میں بُلبل کے واسطے جھُولا

نشیمنوں سے نکلکر پرند گاتے ہیں
ہوا سے کھیلتے پھرتے ہیں چہچہاتے ہیں

اُتر کے آ گئے وادی میں ابر کے ٹکڑے
دیا ہَوا سے پریشاں ہیں رُوئی کے گالے

مری نگاہ میں پھرتا ہے اور ہی نقشا
جو دیکھتا ہُوں خرامِ سکوں نما اُن کا

کھڑے ہیں محفلِ قُدرت کو دیکھنے والے
کسان کھیتوں سے اُٹھ اُٹھ کے جھونپڑوں کو چلے

جفاکشی کا خضر کہیئے ان کِسانوں کو
یہ سبز کرتے ہیں کہسار کی چٹانوں کو

(زمانہ جون ۱۹۰۵ء)

قطعہ

یہ اشعار علاّمہ مرحوم نے نازلی بیگم صاحبہ جنجیرہ کے البم میں بیگم صاحبہ کی درخواست پر تحریر فرمائے تھے۔ علاّمہ کے جو خطوط عطیہؔ بیگم کے نام شائع ہوئے ہیں اُن میں یہ اشعار علاّمہ کے قلم سے لکھے ہوئے موجود ہیں ؛

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر — اور فیضِ آستاں بوسی سے گُل بر سر قمر

روشنی لے کر تری موجِ غبارِ راہ سے — دیتا ہے لیلائے شب کو نور کی چادر قمر

کاروانِ قوم کو ہے تجھ سے زینت اس طرح — جس طرح گردون پہ صدرِ محفلِ اختر قمر

شمعِ بزمِ اہلِ ملّت را چراغِ طور کُن

یعنی ظُلمت خانۂ ما را سراپا نُور کن

۹ر جون ۱۹۰۸ء

لندن

حیدر آباد دکن

شُکریہ

یہ نظم اقبالؔ کے سفر حیدر آباد کی یادگار ہے۔ اس کے ابتدائی نو شعر "نمودِ صبح" کے عنوان سے "بانگِ درا" میں شامل ہو چکے ہیں۔ پوری نظم "مخزن" میں "شکریہ" کے زیرِ عنوان شائع ہوئی تھی۔

ہو رہی ہے زیرِ دامانِ اُفق سے آشکار
صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار
پا چکا فرصت وُرودِ فصلِ انجم سے سپہر
کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار
آسماں نے آمدِ خورشید کی پا کر خبر

محملِ پرواز شب باندھا سرِ دوشِ غبار

شعلۂ خورشید گویا حاصل اس کھیتی کا ہے

بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرار

ہے رواں نجمِ سحر جیسے عبادت خانے سے

سب سے پیچھے جائے کوئی عابدِ شب زندہ دار

کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی

کھینچتا ہو میان کی ظلمت سے تیغِ آب دار

مطلعِ خورشید میں مضمر ہے یُوں مضمونِ صُبح

جیسے خلوت گاہ مینا میں شرابِ خوشگوار

ہے تہِ دامانِ بادِ اختلاط انگیز صُبح

شورشِ ناقوس آوازِ اذاں سے ہم کنار

جاگے کوئل کی اذاں سے طائرانِ نغمہ سنج

ہے ترنّم ریز قانونِ سحر کا تار تار
گرچہ قُدرت نے مُجھے افسردہ دِل پیدا کیا
آنکھ وُہ بخشی کہ ہے نظّارا آشامِ بہار
کھینچ کر سُوئے گلستاں لے گیا ذوقِ نظر
عاشقِ فطرت کو ہے صحنِ گلستاں کُوئے یار
گل نے بُلبل سے کہا لے ہم صفیر آیا ترا
کہتی تھی بُلبل کہ اے مقصُودِ چشمِ انتظار
اتنے دِن غائب رہا تو گُلشنِ پنجاب سے
کر لیا تھا کیا کسی صیّاد نے تُجھ کو شکار
کس سے کہتے راز اپنا لالہ ہائے شعلہ پوش
کِس پہ کرتے درد دل اپنا عنادل آشکار
پوچھتی تھی روز مُجھ سے نرگسِ شبنم فریب

ہوگیا غائب کہاں اپنے چمن کا راز دار
پھول فرقت میں تری سوزن بہ پیراہن رہے
دیدۂ قمری میں تھا صحنِ گلستاں خارزار
غنچۂ نوخیز کو یہ کہہ کے بہلاتی تھی مَیں
ہے یہیں پوشیدہ وُہ وارفتۂ فصلِ بہار
کچھ تو کہہ ہم سے بھی اس وارفتگی کا ماجرا
لے گیا تجھ کو کہاں تیرا دلِ بے اختیار
کس تجلّی گاہ نے کھینچا ترا دامانِ دل
تیری مشت خاک نے کس دیس میں پایا قرار
کیا کہوں اس بوستانِ غیرتِ فردوس کی
جس کے پھولوں میں ہوا اے ہم نوا میرا گذار
جس کے ذرّے مہرِ عالمتاب کو سامانِ نور

جس کی طور افروزیوں پر دیدۂ موسے نثار
جس کے بُلبل عندلیبِ عقلِ کُل کے ہم صفیر

جس کے غنچوں کے لئے رُخسارِ حُور آئینہ دار
خطّۂ جنّت، فضا جس کی ہے دامن گیرِ دل

عظمتِ دیرینۂ ہندوستاں کی یادگار
جس نے اسمِ اعظمِ محبوب کی تاثیر سے

وسعتِ عالم میں پایا صُورتِ گردوں وقار
نور کے ذرّوں سے قُدرت نے بنائی یہ زمیں

آئینہ ٹپکے دکن کی خاک اگر پائے فشار
آستانے پر وزارت کے ہوُا میرا گُذر

بڑھ گیا جس سے مرا ملکِ سخن میں اعتبار
اس قدر حق نے بنایا اس کو عالی مرتبت

آسماں اس آستانے کی ہے اک موجِ غبار

کی وزیرِ شاہ نے وُہ عزّت افزائی مری

چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے تھے نثار

مسند آرائے وزارت راجۂ کیواں حشم

روشن اس کی رائے روشن سے نگاہ روزگار

اس کی تقریروں سے رنگیں گلستانِ شاعری

اس کی تحریروں پہ نظمِ مملکت کا انحصار

لیلائے معنی کا محمل اس کی نثرِ دل پذیر

نظم اُس کی شاہدِ رازِ ازل کی پردہ دار

اُس کے فیض پا کی منّت خواہ کانِ لعل خیز

بحرِ گوہر آفریں دستِ کرم سے شرمسار

سلسلہ اس کی مروّت کا یُونہی لاانتہا   جس طرح ساحل سے عاری بحرِ ناپیدا کنار

دِل رُبا اس کا تکلّم ، خُلق اس کا عطرِ گُل

غنچۂ گُل کے لئے موجِ نفس بادِ بہار

ہو خطا کاری کا ڈر ایسے مُدبّر کو کہاں

جس کی ہر تدبیر کی تقدیر ہو آئینہ دار

ہے یہاں شانِ امارت پردہ دارِ شانِ فقر

خرقہ درویشی کا ہے زیرِ قبائے زرنگار

خاکساری جوہرِ آئینۂ قسمت بنی

دست وقفِ کارفرمائی و دِل مصروفِ یار

نقش وُہ اس کی عنایت نے مرے دِل پر کیا

محو کر سکتا نہیں جس کو مرورِ روزگار

شکریہ احساں کا اے اقبالؔ لازم تھا مجھے

مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

(مخزن - جون ۱۹۱۰ء)

ہمارا تاجدار

(بیادگارِ شاہی دربار تاجپوشی ہزامپیریل میجسٹی جارج پنجم بمقام دہلی)

ہمائے اوجِ سعادت ہو آشکارا اپنا
کہ تاج پوش ہوا آج تاجدار اپنا

اسی کے دم سے ہے عزت ہماری قوموں میں
اسی کے نام سے قائم ہے اعتبار اپنا

اسی سے عہدِ وفا ہندیوں نے باندھا ہے
اسی کے خاکِ قدم پر ہے دل نثار اپنا

زمانہ کانپور۔ دربار شاہی نمبر دسمبر ۱۹۱۱ء
مخزن۔ جنوری ۱۹۱۲ء

بنائے قومیت

۱۶ / اپریل ۱۹۱۲ء کو انجمن حمایتِ اسلام کے ستائیسویں سالانہ اجلاس میں اقبالؔ نے اپنی مشہور نظم "شمع اور شاعر" پڑھی۔ اس سے پہلے متفرق کلام سنایا۔ مثلاً ؎

۱۔ کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

۲۔ ہم نشینِ بے ریایم از رہِ اخلاص گُفت

نیز یہ رُباعی سُنائی جس کا مضمون یہ ہے کہ مسلمانوں کا تعلّق وطن سے کیا ہے:۔

تُو قیس نہیں تو تجھ کو بَن سے کیا کام
زر پاس نہیں تو راہزن سے کیا کام
مسلم کی بنائے قومیت ہے اسلام
مُسلم ہے اگر تُو تو وطن سے کیا کام

سلطان و فقیر

(قطعہ)

اقبالؔ نے اپنی نظم "شمع اور شاعر" انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۱۲ء میں پڑھی۔ چونکہ نظم طویل تھی۔ اس لئے علاّمہ مرحوم نے اس کو دو نشستوں میں سُنایا۔ ایک نشست کی صدارت فقیر سید افتخار الدّین صاحب نے فرمائی اور دُوسری نشست کی مرزا سلطان احمد صاحب نے۔ ثانی الذکر نے کہیں فقرہ چست کر دیا۔ کہ "اقبالؔ بھی عجب ہرجائی ہے کبھی میری بغل میں اور کبھی فقیر افتخار الدین کی بغل میں۔" اقبال نے جواب میں ذیل کے اشعار ارشاد فرمائے۔ اسی مناسبت سے قطعہ میں سلطان اور فقیر کی طرف اشارا ہے:۔

ہم نشینِ بے ریایم از رہِ اخلاص گفت

اے کلام تو فروغِ دیدۂ برنا و پیر

درمیان انجمن معشوق ہرجائی مباش

گاہ با سلطان باشی گاہ باشی با فقیر

گفتمش اے ہم نشیں معذور میدارم ترا

در طلسمِ امتیازِ ظاھرِ ہستی اسیر

من کہ شمعِ عشق را در بزم جاں افروختم

سوختم خود را و سامان دوئی ہم سوختم

پیشکش

(بحضور سر سیّد علی امام مرحوم)

مرقومہ ذیل اشعار مثنوی "اسرار خودی" کے پہلے ایڈیشن میں بطریقِ انتساب درج تھے۔ دوسرے ایڈیشن میں انتساب کو حذف کر دیا۔ مگر بعض اشعار کو تمہید میں جگہ دے دی۔ یہاں کل اشعار یک جا پیش کیئے جاتے ہیں :۔

اے امام اے سیّدِ والا نسب — دودمانت فخرِ اشرافِ عرب

سلطنت را دیدہ افروز آمدی — عقلِ کُل را حکمت آموز آمدی

آشنائے معنیٔ بیگانۂ — جلوۂ شمعِ مرا پروانۂ

مُرغِ فکرم گلستان ہا دیدہ است — از ریاضِ زندگی گل چیدہ است

ایں گل از تارِ رگِ جاں بستہ ام — تازہ تر در دستِ تو گلدُستہ ام

بود نقشِ ہستیم انگارۂ — ناقبولے ۔ ناکسے ۔ ناکارۂ

عشق سوہاں زد مرا آدم شدم — عالمِ کیف و کم عالم شدم

حرکتِ اعصابِ گردوں دیده ام — در رگِ مه دورۂ خوں دیده ام

بہرِ انساں چشمِ من شبہا گریست — تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست

از درونِ کارگاہِ ممکنات — برکشیدم سرِّ تقویمِ حیات

من که ایں شب را چو مه آراستم — گردِ پائے ملّتِ بیضا ستم

ملّتے در باغ و راغ آوازه اش — آتشِ دلہا سرودِ تازه اش

ذرّه کشت و آفتاب انبار کرد — خرمن از صد رومی و عطّار کرد

آہِ گرمم رخت بر گردوں کشم — گرچه دودم از تبارِ آتشم

خامه ام از ہمّتِ فکرِ بلند — راز ایں نه پرده در صحرا فگند

قطره تا ہم پایۂ دریا شود — ذرّه از بالیدگی صحرا شود

ملّت ار جسم ست شاعر چشمِ اوست — جسم را از چشمِ بینا آبروست

چشم از نورِ محبّت روشنم اشکبار از درد اعضائے تنم

نذرِ اشکِ بے قرار از من پذیر

گریہ بے اختیار از من پذیر

مقامِ خود شناس

احتساب خویش کُن از خود مرو یک دو دم از غیر خود بیگانہ شو

تا کجا ایں خوف و وسواس و ہراس اندریں کشور مقامِ خود شناس

ایں چمن دارد بسے شاخِ بلند

بر نگوں شاخ آشیانِ خود مبند

بحضورِ تاجدارِ دکن

اقبالؔ نے "رموزِ بے خودی" کا ایک نسخہ تاجدارِ دکن کی
خدمت میں ارسال کرتے وقت یہ اشعار کہے۔

اے مقامت برتر از چرخِ بریں	از تو باقی سطوتِ دینِ مبیں
جلوۂ صدّیق از سیمائے تو	حافظِ ما تیغ جوشن خائے تو
از تو مارا صبحِ خنداں شامِ ہند	آستانت مرکزِ اسلامِ ہند
دوشِ ملّت زندہ از امروزِ تو	تابِ ایں برقِ کہن از سوزِ تو

شفیقِ محترم مولوی عبدالرّزاق صاحب اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل حیدرآباد دکن
نے ۱۹۲۳ء میں علاّمہ مرحوم کی اجازت سے علاّمہ کے اُردو کلام کا مجموعہ "کلّیاتِ اقبال"
کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس مجموعے میں یہ قطعہ درج ہے۔ (کلّیاتِ اقبال صفحہ ۸۵-۸۶)

بندگانستیم ما ، تُو خواجۂ　　　　از پئے فردائے ما دیباچہ
گوہرم را شوخیش بے باک کرد　　　　تا گریبانِ صدف را چاک کرد

پیش سُلطاں ایں گہر آوردہ ام
قطرۂ خونِ جگر آوردہ ام

وفادارانِ سہ قسم

قطعہ

وفاداراں سہ قسم اند ار بدانی
زبانی اند و نانی اند و جانی

زبانی را ز منصب عزّتے دِہ
زمینے بر سرِ نہرے بہ نانی

اگر باغی بخواند دیگراں را
بباید داستاں از وے برانی

اگر ذوقِ ملاقاتے تو دارد
جوابش دہ بحرفِ لن ترانی

وفادارانِ جانی را بدست آر
اگر خواہی ز جانی جاں ستانی

سنہ ۱۹۱۵ء

اقبال نے وفاداروں کی تین قسمیں گنائی ہیں ۔ زبانی خوشامد کرنے والے، حصولِ معاش یا جاگیر کے لئے آگے پیچھے پھرنے والے اور ضرورت کے وقت جان دینے والے!

پنجاب کا جواب

یہ نظم پہلی جنگِ عظیم کے دوران سر مائیکل اوڈ وائر گورنر پنجاب کی فرمائش پر لکھی اور ۱۹۱۸ء کے ایک مشاعرے میں پڑھی گئی جو جنگی تنظیمات کے سلسلے میں ہوا تھا۔

اے تاجدارِ خطّۂ جنّت نشانِ ہند — روشن تجلّیوں سے تری خاورانِ ہند
محکم ترے قلم سے نظامِ جہانِ ہند — تیغِ جگر شگاف تری پاسبانِ ہند

ہنگامۂ وغا میں مرا سر قبول ہو
اہلِ وفا کی نذرِ محقّر قبول ہو

تلوار تیری دہر میں نقّادِ خیر و شر — بہروز، جنگ توز، جگر سوز، سینہ در
رایت تری سپاہ کا سرمایۂ ظفر — آزادہ، پرکشادہ، پری زادہ، یم سپر

سطوت سے تیری پُختہ جہاں کا نظام ہے

ذرّے کا آفتاب سے اُونچا مقام ہے

آزادیٔ زبان و قلم ہے اگر یہاں
سامانِ صُلحِ دیر و حرم ہے اگر یہاں

تہذیبِ کاروبارِ اُمم ہے اگر یہاں
خنجر میں تاب تیغ میں دم ہے اگر یہاں

جو کچھ بھی ہے عطائے شہِ محترم سے ہے

آبادیٔ دیار ترے دم قدم سے ہے

وقت آگیا کہ گرم ہو میدانِ کارزار
پنجاب ہے مخاطبِ پیغامِ شہریار

اہلِ وفا کے جوہرِ پنہاں ہوں آشکار
معمور ہو سپاہ سے پہنائے روزگار

تاجر کا زر ہو اور سپاہی کا زور ہو

غالب جہاں میں سطوتِ شاہی کا زور ہو

دیکھے ہیں مَیں نے سیکڑوں ہنگامۂ نبرد
صدیوں رہا ہوں میں اسی وادی کا رہ نورد

طفلِ صغیر بھی مری جنگاہ میں ہیں مرد
ہوتے ہیں انکے سامنے شیروں کے رنگ زرد

میں نخلِ ہوں وفا کا محبت ہے پھل مرا

اِس قول پہ ہے شاہدِ عادل عمل مرا

ہندوستاں کی تیغ ہے فتّاح ہشت باب
خونخوار، لالہ بار، جگردار، برق تاب

بیباک، تابناک، گہر ناک، بے حجاب
دلبند، ارجمند، سحر خند، سیم ناب

یہ تیغِ دل نواز اگر بے نیام ہو

دشمن کا سر ہو اور نہ سودائے خام ہو

اہلِ وفا کا کام ہے دُنیا میں سوز و ساز
بے نُور ہے وہ شمع جو ہوتی نہیں گداز

پردے میں موت کے ہے نہاں زندگی کا راز
سرمایۂ حقیقتِ کبریٰ ہے یہ مجاز

سمجھو تو موت ایک مقامِ حیات ہے

قوموں کے واسطے یہ پیامِ حیات ہے

اخلاص بے غرض ہے، صداقت بھی بے غرض
خدمت بھی بے غرض ہے اطاعت بھی بے غرض

عہدِ وفا و مہر و محبت بھی بے غرض
تختِ شہنشہی سے عقیدت بھی بے غرض

لیکن خیالِ فطرتِ انساں ضرور ہے

ہندوستاں پہ لطفِ نمایاں ضرور ہے

جب تک چمن کی جلوۂ گُل پر اساس ہے
جب تک فروغِ لالۂ احمر لباس ہے

جب تک نسیمِ صبح عنادل کو راس ہے
جب تک کلی کو قطرۂ شبنم کی پیاس ہے

قائم رہے حکومتِ آئیں اسی طرح

دبتا رہے چکور سے شاہیں اسی طرح

مکافاتِ عمل

یہ اشعار منشی سراج الدین صاحب میر منشی ریذیڈنسی کشمیر کی بیاض سے لئے گئے ہیں جو انھوں نے منشی محمد الدین فوقؔ کے رسالہ نظام لاہور بابت فروری ۱۹۱۹ء سے نقل کئے تھے۔

ہر عمل کے لئے ہے ردِّ عمل　　دہر میں نیش کا جواب ہے نیش

شیر سے آسمان لیتا ہے　　انتقامِ غزال و اشتر و میش

سرگذشتِ جہاں کا سرِّ خفی　　کہہ گیا ہے کوئی نکو اندیش

شمع پروانہ را بسوخت ولے

زود بریاں شود بروغنِ خویش

ایک ویدمنتر کا ترجمہ

خویشوں سے ہو اندیشہ نہ غیروں سے خطر ہو

احباب سے کھٹکا ہو نہ اعدا سے حذر ہو

روشن میرے سینے میں محبت کا شرر ہو

دِل خوف سے آزاد ہو بے باک نظر ہو

پہلو میں مرے دل ہوئے آشامِ محبّت

ہر شے ہو مرے واسطے پیغامِ محبّت

زمانہ کان پور۔ اپریل ۱۹۱۹ء

نورِ توحید سے گر قوّتِ بیدار ہے تو
اپنی قسمت کا یہاں آپ ہی مُختار ہے تو

حق کے ہوتے ہوئے باطل سے ہراساں کیوں ہے
گردنِ کفر پہ چلتی ہوئی تلوار ہے تو

تیری ہستی ہی پہ موقوف ہے نظمِ عالم
دستِ قُدرت کا بنایا ہُوا شاہکار ہے تو

ذرّے ذرّے میں جِلا ہے تیری تکبیروں سے
ظُلمتِ دہر میں اک مطلعِ انوار ہے تو

ہو یقیں مُردہ تو ہے سنگ بھی تجھ سے بہتر[1]

ہو یقیں زندہ تو پھر حیدرِ کرّار ہے تو

حق ہی کہہ حق ہی نے قوموں کو اُبھارا اقبالؔ

حق ہے سینے میں ترے مخزنِ اسرار ہے تو

---

[1] کلامِ اقبالؔ کے دلدادہ ایک بزرگ خورشید الحسن صاحب کی بیاض میں یہ مصرع یُوں ہے:-

ہو یقیں مُردہ تو سگ تجھ سے ہے بہتر سَو بار

معراج

ہر دو جہاں میں ذکرِ حبیبِؐ خدا ہے آج
ہر ذرّے کی زبان پہ صلِّ علیٰ ہے آج

معراجِ مصطفیٰؐ سے کھلا عقدۂ حیات
رُوحِ نبیؐ میں جلوۂ نورِ خدا ہے آج

قوسین میں ثبوت ہے اس جذب و شوق کا
ہر لمحہ ذکر و فکر میں درسِ بقا ہے آج

وہ بزمِ ناز وہ گُل و بُلبل کی خلوتیں
اُلفت میں امتیازِ من و تُو فنا ہے آج

اِک جست ہی میں طے ہیں دو عالم کی وسعتیں
اور رشتۂ زمان و مکاں کٹ گیا ہے آج

طائرِ حریمِ قدس کے سب نغمہ سنج ہیں
رُوح الامیں بھی شوق سے مدحت سرا ہے آج

جو منتظر ازل سے تھا اس کے قدُوم کا
بہرِ نبیؐ وہ گُنبدِ بے در کھُلا ہے آج

حُوریں خوش آمدید پُکاریں بہشت میں
از فرش تا بہ عرشِ صدا مرحبا ہے آج

یہ رات وُہ ہے جس پہ کرے رشک دِن کا نُور
سایہ ہر ایک سایۂ بالِ ہُما ہے آج

عشقِ نبیؐ میں قبلہ نما سے ہُوں بے نیاز
نورِ یقیں سے قلب ہی قبلہ نما ہے آج

اقبالؔ آ کہ پھر اسی چوکھٹ پہ جُھک پڑیں
آغوشِ رحمت انکی اسی طرح وا ہے آج

جوہرِ ایمان

چشمِ باطل پہ عیاں جوہرِ ایماں کر دے

دے کے ذرّوں کو جِلا مہرِ درخشاں کر دے

دَور پھر آیا ہے مسلم کی جہاں بانی کا

دفترِ کُفر کو دُنیا میں پریشاں کر دے

عام کی عقل نے یاں وہم و گماں کی ظُلمت

شمعِ ایمان کو سینوں میں فروزاں کر دے

ہے محبّت میں وُہ قُوّت کہ بنے سنگ بھی موم

حسنِ اخلاق سے کافر کو مُسلماں کر دے

ذرّے ذرّے کو بنا وسعتِ صحرا کا امیں

جوشِ توحید سے ہر قطرے کو طُوفاں کر دے

پردۂ جہل اُٹھا اپنی خودی سے غافل

اس کی پوشیدہ خدائی کو نمایاں کر دے

عہدِ حاضر ہے جہنّم تو مُسلماں ہے خلیل

نورِ ایمان سے آتش کو گُلستاں کر دے

خوفِ شر کیوں ہو اگر خیر ہے مقصد تیرا

تیری تسخیر تو ابلیس کو لرزاں کر دے

دِل کو مایُوس نہ کر رحمتِ حق سے اقبالؔ

مُرغِ افسردہ کو پھر اپنے غزلخواں کر دے

شمعِ زندگانی

اَے شمعِ زندگانی کیوں جھلملا رہی ہے

شاید کہ یادِ حسرت تجھ کو بجھا رہی ہے

ہاں ہاں ذرا ٹھہر جا اس منزلِ فنا میں

بزمِ جہاں کی اُلفت مجھ کو ستا رہی ہے

مجھ زار و ناتواں پر للّٰہ اب کرم کر

کیوں نخلِ آرزُو پر بجلی گرا رہی ہے

دل کا بُخار کچھ تو مجھ کو نکالنے دے

گزری ہوئی کہانی اب تک رُلا رہی ہے

کیا نااُمید ہوکر بزمِ جہاں سے جاؤں

کیوں خاک میں ابھی سے مجھ کو ملا رہی ہے

دُنیا کے یہ مناظر پیشِ نظر ابھی ہیں

مُجھ کو میری تمنّا اب تک ستا رہی ہے

برباد ہو رہی ہے کشتِ مُراد میری

مثلِ چنار اس کو ناحق جلا رہی ہے

ارمان و آرزُو پر تجھ کو نہ رحم آیا

کیوں میری حسرتوں کو دِل سے مٹا رہی ہے

اے شمع کیوں ابھی سے آنکھیں ہیں سب کی پُرنم

کیا مرگِ ناگہانی تشریف لا رہی ہے

رولیں گے بعد میرے جی بھر کے رونے والے

کیوں تُو ابھی سے رو کر سب کو رُلا رہی ہے

تیری اگر خوشی ہو مرنے پہ مَیں ہُوں راضی

شمعِ حیات گُل ہو کیوں جِھلملا رہی ہے

کلاہِ لالہ رنگ

اے نشانِ قومِ مُسلم اے کلاہِ لالہ رنگ

اے لباسِ ماسلف مقتولِ تہذیبِ فرنگ

اے کہ تیری شکل سے لرزاں تھا ہر میدانِ جنگ

اے کہ تجھ سے سینۂ مُسلم میں اُٹھتی تھی اُمنگ

تجھ سے رُخ بدلا ہے کیسا گردشِ ایّام نے

عہد باندھا ہے مٹانے کا ترے اسلام نے

قومِ ٹرکی آہ جو سرمایۂ توقیر تھی

قوم اور وُہ قوم جو اسلام کی شمشیر تھی

جس کی ہستی سے بقائے نعرۂ تکبیر تھی

تو درخشاں جس کے سر پر صورتِ تنویر تھی

جو رہے صدیوں سے کوشاں تیری عزّ و جاہ میں

نذر کر دے تجھ کو آزادی کی قرباں گاہ میں

تجھ سے قائم تھی مسلمانوں کی شانِ مذہبی

تجھ سے روشن تھا ہمارا آسمانِ مذہبی

وضعداری لبکہ ہے رُوح و روانِ مذہبی

تھا بجا کہتے تجھے گر ہم نشانِ مذہبی

قوم کا طرز و تمدن خاص اگر اپنا نہیں

آج اس معمورۂ عالم میں اس کی جا نہیں

ہو مسلماں جس گھڑی مسجد میں مصروفِ نماز

سجدۂ خالق سے اُٹھے جب سرِ قومِ حجاز

اور کھولے تیرا جلوہ شوخیٔ لالہ کا راز

صاف آتی ہے نظر شانِ خدائے بے نیاز

جذبۂ مُسلم کی تُو اِک مختصر تفسیر ہے

تو شہیدانِ وفا کے خُون کی تصویر ہے

خلق کہتی تھی تجھے اَے تُرک تُو غیوّر ہے

دِل ترے پہلو میں سُنتے تھے کہ برقِ طُور ہے

پھر یہ کیسا رنگ بدلا کیا تجُھے منظور ہے

مذہبیت چھوڑ دی رُوحانیت کافور ہے

مذہب و وضع تمدّن سب کی بربادی ہوئی

خُوب اے جانباز حاصل تجھ کو آزادی ہوئی

پھر سنبھلتی کاش تو اے ملّتِ عالی تبار

اِتنی جلدی تجھ میں تبدیلی نہ ہوتی آشکار

پھر صدا سُن لے مری یہ گوشِ دل سے ایک بار

تیری قسمت کا نہیں ہے تیری کوشش پر مدار

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے[1]

---

[1] "ہو گئی رُسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ" جیسے جگر خراش مصرعوں کے علاوہ ٹیپ کا یہ شعر بھی اقبالؔ کی مشہور نظم "خضرِ راہ" میں موجود ہے۔ جو انجمن حمایتِ اسلام کے ۳۷ ویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۲۲ء میں پڑھی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ ترکوں کی اس تحریک سے متاثر ہو کر کہی گئی تھی جس میں قومی لباس کو ترک کر دینے پر زور دیا جاتا تھا۔

یہ اشعار علاّمہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے منشی سراج الدین صاحب کی بیاض میں چسپاں ہیں۔ شروع میں منشی سراج الدین صاحب کا یہ خیال تھا کہ یہ اشعار مثنوی اسرارِ خودی کے ہیں مگر جب مثنوی شائع ہوئی تو یہ خیال غلط ثابت ہوا۔

فرد بر می خیزد از مشتِ گلے — قوم زائد از دلِ صاحب دلے

فرد بہر شصت و ہفتادست و بس — قوم را صد سال مثلِ یک نفس

زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن — زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن

مرگِ فرد از خشکیِ رودِ حیات

مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات

خلافت اور ترک و عرب

ظہوری کی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے ؎

ستم و سخت جانی ہم ہست   کو ہم و ناتوانی ہم ہست

حضرت گرامی نے اس پر ایک غزل کہی، جو فروری سنہ ۱۹۲۴ء کے معارف میں شائع ہوئی۔ اُس میں ایک شعر تھا ع

فقر از ترکمانی ہم ہست

جو حضرت اقبال کو بہت پسند آیا تھا اور اس پر تضمین کی تھی۔ حضرت اقبال اپنے ایک گرامی نامہ میں سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں "پیامِ مشرق" میں اس واسطے اس کو داخل نہ کیا کہ اس کے اشعار کی بندش کچھ بہت پسند نہ آئی۔ اگر آپ کو پسند ہو تو مجھے اشاعت میں کوئی عذر نہیں"۔

مولانا نے اس پر لکھا "یہ سچ ہے کہ پیامِ مشرق کے ساز میں یہ لحنِ شیرازی کچھ زیادہ سامعہ نواز نہ ہو تو بھی اس سے الگ اقبالؔ کی صدا کا ہر حرف گوشوارۂ حقیقت ہے۔ (معارف جلد ۱۳، نمبر ۲، صفحہ ۱۴۴ - بابت فروری سنہ ۱۹۲۴ء)

سخنے را نۂ کہ جز قرشی — بر سرِ مسند نبیؐ نہ نشست

درس گیر از گرامی ہمہ ورد — کہ بُرید از خود و باوُ پیوست

رمز ترک و خلافتِ عربی — گفت آں مے گسارِ بزمِ الست

"ماہ را بر فلک دو نیم کنیم
فقر را ترکمانئ ہم ہست"

قطعہ

۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ء کو یورپ کی پہلی جنگِ عظیم ختم ہوئی۔ اسکے بعد فتح کا جشن منایا گیا۔ لاہور میں اس جشن کے موقعہ پر ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۸ء کو ایک زبردست مشاعرہ منعقد ہوا جس میں سر مائیکل اوڈوائر گورنر پنجاب کی فرمائش پر اقبالؔ نے یہ اشعار سُنائے۔ "شعاعِ آفتاب" کے عنوان سے جو نظم بانگِ درا میں موجود ہے وہ بھی اسی مشاعرے میں پڑھی گئی تھی ؎

ہیچ میدانی کہ صورت بند ہستی با فرانس
فکرِ رنگین و دلِ گرم و شرابِ ناب داد

روس را سرمایۂ جمعیّتِ ملّت رُبود
قہرِ او کوہِ گراں را لرزۂ سیماب داد

ملک و تدبیر و تجارت را بہ انگلستاں سپرد
جرمنی را چشمِ حیران و دلِ بیتاب داد

تا برانگیزد نوائے حُرّیت از سازِ دہر
صدرِ جمہوریۂ امریکہ را مضراب داد

ہر کسے در خورد فطرت از جناب او برد
بہر ما چیزے نہ بُود و خویش را با ما سپرد

جلّیانوالہ باغ امرتسر

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ پاک
غافل نہ رہ جہان میں گردُوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بُخل نہ کر اس نہال سے

مرثیہ اکبر الہ آبادی

یہ مرثیہ پیامِ مشرق کے پہلے ایڈیشن میں شائع ہوا تھا ۔ مگر بعد کے ایڈیشنوں سے علاّمہ نے حذف کردیا۔ اسکی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ پیامِ مشرق میں علاّمہ کے پیشِ نظر زیادہ تر وہ مسائل تھے جن کا تعلّق اقوام اور ملل کی موت اور زندگی سے تھا اور مرثیہ کی نوعیت ایک دوست کا نوحہ ہونے کی حیثیت سے صرف شخصی اور ذاتی تھی ۔

دریغا کہ رخت از جہاں بست اکبر　　حیاتش بحق بود روشن دلیلے

سرِ ذروۂ طورِ معنی کلیمے　　بہ بُت خانۂ دورِ حاضر خلیلے

نوائے سحر گاہِ اُو کارواں را　　اذانِ درائے پیامِ رحیلے

زدِ لہا برافگندۂ لات وعُزّیٰ　　بجانہا کشائندۂ سلسبیلے

دماغش ادب خوردۂ عشق و مستی

دلش پرورش دادہ جبرئیلے

سائمن کمیشن

سائمن آں کہ بدل شہر و دیار آمد و رفت — دلبرے بود کہ مارا بکنار آمد و رفت

باز لاہور ز آفات خزاں شد پامال — صف در گلشنِ پنجاب بہار آمد و رفت

صبحِ اُمید کہ از زاویۂ غیب رسید — خبر آورد کہ عہدِ شبِ تار آمد و رفت

اے عزیزانِ وطن بر سرِ گنجِ پنجاب — مژدگانے کہ ز برطانیہ کار آمد و رفت

. . . . از حلقۂ رندانِ جہاں

کہ دگر بار . . . . . زار آمد و رفت

اس قطعہ کی تصریح کرتے ہوئے عابد رضا بیدار صاحب اپنے ایک مضمون ماہنامہ "ہم قلم" کراچی بابت دسمبر ۱۹۶۲ء میں لکھتے ہیں کہ "اقبال کے ایک گُم نام ہم عصر ریاست حسین خان نے ساری عمر رامپور میں گذاری . . . . . رسالے جمع کرنے کا شوق انہیں خبط کی حد تک

تھا۔ رسالوں میں سے انتخاب کر کے اصل صولت پبلک لائبریری کو دے دیتے تھے۔

اس قسم کے کوئی پندرہ مجموعے انھوں نے اپنے ترکہ میں چھوڑے۔ کوئی تین سال ہوئے

ان کا انتقال ہوگیا ...... یہ پانچ شعر ریاست حسین خاں کے قلمی مسودے میں

دو حصّوں میں منقسم ہیں۔ پہلے دو شعر لکھے ہیں اور ان کے اوپر جلی قلم سے "سرجان سائمن"

اور خفی سے "پچگونگئ آمد و شد او و نوحہ وفا کیشانِ ازل" لکھا ہے۔ نیچے کے دو شعروں پر

ترانۂ احرار کا عنوان دیا ہے۔ بظاہر یہ پانچوں ایک ہی نظم کا حصّہ ہیں۔ اور ان دو تقسیموں

سے ذیلی عنوان مراد لینا چاہیئے۔ پانچواں شعر جتنا میری سمجھ میں آیا اُسی قدر لکھ دیا ہے۔"

سُوراج (در حُدودِ سلطنت)

شبے بہ میکدہ پیرِ کلیسیا می گفت | کہ رندِ میکدۂ تو بسے تنک جام است
گرفتم ایں کہ ثمر نجپتہ شد و لے گویم | اگر برید ز شاخِ نہالِ ما خام است
ترا ز پنجۂ شاہیں اماں دہد صیّاد | فغاں چہ سود کہ آزردگی تہ دام است
منِ ستم زدہ ایں نکتہ را نہ فہمیدم | کہ فکرِ کہنۂ ہندی اسیر اوہام است
سروشِ مطلعِ میر رضیؔ بیادم داد | چہ مطلعے کہ سراپا نوائے الہام است

"نمک شناس اسیراں چو از قفس رستند
بہ نخل خانۂ صیّاد آشیاں بستند"

ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی نگرانی اور قاضی عبدالمجید قرشی کی ادارت میں امرتسر سے "تنظیم" اخبار جاری ہوا تھا۔ اس کے شمارہ نمبر ۵۵ بابت اپریل ۱۹۲۷ء میں میر رضیؔ کے شعر پر یہ تضمین شائع ہوئی تھی۔ اس سے ملتے جلتے سات شعر کی ایک غزل زبورِ عجم میں بھی ہے۔ مگر مندرجہ بالا اشعار اس میں نہیں۔

آئینِ جدید

۱۹۳۷ء میں مولانا مرتضیٰ احمد خان میکشؔ نے روزنامہ احسان لاہور کے سالنامے کے لئے تبرک کے طور پر دو ایک اشعار کی فرمائش کی۔ اقبالؔ نے حسب ذیل ابیات اسی وقت لکھوا دیں ؎

نہ آئینِ نوی در کشورِ ہند — جہانِ دیگرے ایجاد کردند
غلامے را کہ بود اندر شکنجہ — دُعا گفتند و نیم آزاد کردند

وائسرائے کا دربار

کیا خوب یہ عالم ہے اِدھر مد ہے اُدھر جزر
اِک ہاتھ میں دستور ہے اِک ہاتھ میں ہے نذر

(سالنامہ اخبار احسان لاہور ۱۹۳۷ء)

حالی اور اقبال

انجمن حمایت اسلام لاہور کا اُنیسواں سالانہ اجلاس یکم اپریل سے ۳ر اپریل ۱۹۰۴ء تک اسلامیہ کالج کے وسیع صحن میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مولانا حالی، ڈاکٹر نذیر احمد مرزا ارشد گورگانی، میاں محمد شفیع، شیخ عبدالقادر، میاں فضل حسین، مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی وغیرہ جیسے اکابر جمع تھے۔ اسی سال اقبالؔ نے اپنی نظم "تصویر درد" پڑھ کر سُنائی۔ مولانا حالیؔ نے ایک شعر بہت پسند کیا۔ اور انجمن کو دس روپیہ کا نوٹ عطا فرمایا۔ سارا میدان نعرہ ہائے تحسین سے گُونج اُٹھا۔ شاعر کی اس سے زیادہ ہمت افزائی اور کیا ہوسکتی تھی کہ خدائے سخن حالیؔ اس کے کلام کی داد دے۔

کچھ عرصہ بعد مولانا حالیؔ کے پڑھنے کی باری آئی۔ یہ وہ وقت تھا کہ ضعیفی کے باعث ان کی آواز سننی مشکل ہوتی تھی۔ لیکن اس جلسہ میں جہاں لاتعداد انسانوں کا

مجمع تھا۔ لوگ بیقرار تھے۔ کہ خود اس مصلحِ اعظم کی زبانِ فیض ترجمان سے اس کا پیغام سُنیں۔ اس لئے عجب افراتفری سی پیدا ہوگئی۔ آخر شیخ عبدالقادر صاحب نے مجمع کو خاموش کیا۔ اور فرمایا کہ آپ مولانا حالؔی کی زبان سے تبرّکاً جو کچھ بھی سُنا جائے سُن لیجئے۔ بعد کو یہی نظم اقبالؔ پڑھ کر سُنائیں گے۔

جب اقبالؔ مولانا حالؔی کی نظم سُنانے کھڑے ہوئے تو اوّل ایک رُباعی فی البدیہہ کہہ کر پڑھی جو اس موقعہ کے لحاظ سے بھی نیز اپنی بلاغت کے اعتبار سے بھی بہت خوب ہے ؎

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالؔی
معمورِ مے حق سے ہے جامِ حالؔی
مَیں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالؔی

مندرجہ ذیل اشعار ۲۶ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو پانی پت میں مولانا حالؔی کی صدسالہ

برسی پر نواب صاحب بھوپال کی موجودگی میں پڑھے گئے اور یہ اب تک اقبال کی کسی کتاب میں درج نہیں ہوئے ہیں ؎

مزاجِ ناقہ را مانند عرفی نیک می بینم | چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم
حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو | ز الطافِ تو موجِ لالہ خیزد از خیابانم
طوافِ مرقدِ حالی سزد اربابِ معنی را | نوائے او بجانہا افگند شورے کہ می دانم

بیا تا فقر و شاہی در حضورِ او بہم سازم
تو بر خاکش گہر افشاں و من برگِ گُل افشانم

ایک دوسرے موقعہ پر حالی سے متعلق مندرجہ ذیل قطعہ کہا تھا ؎

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد | سیّد دگر اُو را نمے از اشکِ سحر داد
حالی ز نواہائے جگر سوز نیاسود | تا لالۂ شبنم زدہ را داغِ جگر داد

(۲۴ر جون ۱۹۳۵ء)

عرشیؔ، اقبال اور ظفر علی خان

خمخانۂ اقبالؔ کے مستوں کو شاید مے ناب میں حضرت عرشیؔ اور مولانا ظفر علی خان کے اشعار کی آمیزش خوشگوار نہ معلوم ہو۔ مگر ان دونوں نظموں سے علامہ کے اشعار کی وضاحت ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کو یہاں یک جا کر دیا گیا ہے۔

پیام عرشیؔ امرتسری بنام اقبالؒ

اے ترنّم ہائے رنگینت گلستانِ سخن
معنئ عیسیٰ دمت بخشندۂ جانِ سخن

اے حیات تازہ دادی نغمہ را از نطقِ خویش
گشتۂ شور افگن ارض و سما از نطقِ خویش

از عروسِ طبع برہا جلوہ ہا پاشیدۂ
وز چمن زارِ تکلّم تازہ گُلہا چیدۂ

شعلہ سوز اندوز از آتش نوائی ہائے تو
بادہ کیف آموز از تخییلِ ذوق افزائے تو

بر فراز طارمِ اعلیٰ لوا افراختی
نزدِ خود را در قمار جمع ما در باختی

یافت از تو مرکزے ہنگامۂ بیتاب را
ریختی تخمِ سکوں در مزرعۂ سیماب را

لیکن اے اقبال ایں نگیں نوائی تابکے
از نفس گرمی و از دل شعلہ زائی تابکے

اے توئی در آشیان و گلشنت برباد رفت
نغمہ ماندی و پرواز تو با صیاد رفت

خیز و گلبانگِ دہل در گنبدِ خضرا فگن
از قبور آیند خلقے شور صور آسا فگن

خیز و صوتِ خود بہ آہنگِ جز تبدیل کُن
قطرۂ داری بیاور در شرر تحلیل کُن

خیز زیں کنجِ متانت جلوۂ برما فگن
ہاں بیا ہمچوں ثنائی گوئے در میداں فگن

علّامہ اقبالؒ کا جواب

دانی کہ چیست شیوۂ مردانِ پختہ کار
عرشی گماں مدار کہ پیمانہ ام شکست

دارم ہنوز از کرمِ ساقیٔ حجاز
آہے درونہ تابکے خیز د ز سینہ مست

از شاخسارِ فطرتِ من می دمد ہنوز
آں لالۂ کہ موجِ نسیمے دلش نہ خست

لیکن شنیدہ کہ دمِ گردشِ شراب | پیرِ عجم چہ گفت برندانِ مے پرست

دانا کہ دید شعبدۂ چرخِ حقّہ باز

ہنگامہ بازچید و درِ گفتگو بہ بست

۲۲ر مئی ۱۹۲۰ء (زوالِ آلِ عثمان)

عرشی اور اقبال کی قیل و قال پر ظفر علیخاں کا محاکمہ

بندہ نواز ہم سے نہیں کچھ چھپی ہوئی | پیرِ فلک کی شعبدہ بازی کی بود و ہست

مانا کہ آسمان سے شمس و قمر کی فوج | پیہم اتر رہی ہے کہ ظلمت کو دے شکست

لیکن نہ قولِ سعدیٔ شیراز بھولئے | چھوٹا نہیں جو ہاتھ سے سررشتۂ الست

"رفتن بپائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت

حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است

احتسابِ خویش

شیخ عطاء اللہ صاحب ایم۔ اے مرتّب "اقبال نامہ" راقم کو اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: "کوشش تو کر رہا ہوں کہ اقبالؔ کے ہاتھ کی ہر نوعیت کی تحریریں دستبرد زمانہ سے محفوظ ہو جائیں۔ تین شعر (غیر مطبوعہ) انتخابات کے ایک پوسٹر سے لاہور سے ملے ہیں۔ امید ہے کہ ان کے مطالعہ سے آپ کو مسرّت حاصل ہوگی۔ خیال ہے کہ اقبال نامہ کے صفحہ اوّل پر اسے درج کراؤں۔ جس پوسٹر میں یہ اشعار تھے وہ شیخ صاحب کے پاس موجود ہے۔ مگر اس کے علاوہ کوئی شہادت ایسی نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ اشعار علامہ مرحوم ہی کے ہیں۔ اگر ناظرین کرام میں سے کسی کو اس کا علم ہو تو براہِ کرم راقم الحروف کو مطلع فرمائیں۔

احتسابِ خویش کن از خود مرو

یک دو دم از غیرِ خود بیگانه شو

تا کجا ایں خوف و وسواس و ہراس

اندریں کشور مقامِ خود شناس

ایں چمن دارد بسے شاخِ بلند

بر نگوں شاخ آشیانِ خود مبند

رُوح الذّہبؔ

(قطعہ)

حکیم عبدالوہاب صاحب انصاری عرف حکیم نابینا جو شروع میں حیدر آباد دکن میں سکونت پذیر تھے مگر بعد میں دہلی میں مطب فرمانے لگے تھے۔ اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے۔ علامہ مرحوم نے آخری زمانہ علالت میں حکیم صاحب قبلہ کی طرف رجُوع کیا تھا۔ حکیم صاحب نے علاّمہ کے لئے اپنی شہرۂ آفاق دوا "رُوح الذّہب" تجویز فرمائی تھی۔ اس دوا سے علاّمہ کو بہت افاقہ ہوا تھا۔ اس افاقہ کے تاثرات علامہ نے اس قطعہ میں قلمبند فرمائے ہیں۔ یہ قطعہ علاّمہ مرحوم نے جناب نذیر نیازی کو ایک خط میں لکھ کر بھیجا تھا۔ تاکہ حکیم صاحب قبلہ کے گوش گزار کر دیں۔ جناب نذیر نیازی

نے اس واقعہ کا ذکر اپنے مضمون "اقبال کی آخری علالت" میں کیا ہے ؎

ہے دو رُوحوں کا نشیمن پیکرِ خاکی مرا
رکھتا ہے بیتاب دونوں کو مرا ذوقِ طلب
ایک جو اللہ نے بخشی مجھے صُبحِ ازل
دوسری ہے آپ کی بخشی ہوئی "رُوح الذّہب"

مولانا محمّد علی کی وفات پر

یہ اشعار علاّمہ مرحوم نے مولانا محمّد علی کی انگلستان میں وفات پر لکھے تھے۔ اور جریدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ راقم الحروف نے یہ اشعار سر عبدالقادر کی زبانی سُنے تھے۔ عبدالقادر صاحب کو یہ مصرع بے حد پسند تھا ؏

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبرؐ گذشت

یک نفس جانِ نزارِ او تپید اندر فرنگ
تا مژہ برہم زنیم از ماہ و پرویں در گذشت

اے خوشا مشتِ غبارِ او کہ در جذبِ حرم
از کنارِ اندلس از ساحلِ بربر گذشت

خاکِ قدس اورا بآغوشِ تمنّا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبرؐ گذشت

می نگنجد جز بآں خاکے کہ پاک از رنگ و بوست
بندۂ کو از تمیزِ اسود و احمر گذشت

جلوۂ او تا ابد باقی بچشمِ آسیاست
گرچہ آں نورِ نگاہے خاور از خاور گذشت

(منقول از بیاض منشی سراج الدین مرحوم)

دُعا

مولانا عبدالمجید صاحب سالکؔ مرحوم مدیر انقلابؔ نے "اقبال اور اس کا پیغام" (جو ڈاکٹر تصدق حسین صاحب خالدؔ اور میاں محمد رفیق صاحب خاورؔ کی کوششوں کا نتیجہ ہے) کے دیباچہ میں علامہ مرحوم کے یہ اشعار نقل کئے ہیں۔ مولانا کی تمہید کے ساتھ یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

"آج سے چند سال پیشتر جب علامہ اقبال دردِ گردہ میں مبتلا ہوئے تو اس ظالم مرض کی صعوبت سے بیقرار ہو کر آپ نے خدا کو مخاطب کیا کہ ..... ؎

دِہ مرا فرصتِ ہُو حق دو سہ روزے دگرے کہ دریں دیرِ کہن بندۂ بیدار کجاست

میر و مرزا بسیاست دل و دیں باختہ اند جُز برہمن پسرے محرمِ اسرار کجاست

حرفِ ناگفتہ مجالِ نفسے می خواہد

ورنہ مارا بجہانِ تو سروکار کجاست

گرامی کی وفات پر

آہ مولانا گرامی از جہاں بربست رفت
آنکہ ز د فکر بلندش آسماں را پشت پای

معنیٔ مستور او در لفظ رنگینش نگر
مثل حورے بے حجاب اندر بہشت دلکشای

از نوائے جاں فزائے او عجم راز ندگی
جام جمشید از شراب ناب او گیتی نمای

یاد ایامے کہ با او گفتگوہا داشتم
اے خوشا حرفے کہ گوید آشنا با آشنای

بر مزارش پست تر کن پردہ ہائے ساز را
تا نہ گردد خواب او آشفتہ از شورِ نوای

خطاب بہ شریفِ حرم

با مُرغ حرم از من دلِ سوختہ فرما — اے آنکہ بہ صحرا نفس آزاد برآری
"بو ہائے گلستانی و از طالعِ گمراہ — ترسم کہ سر از خانۂ صیّاد برآری"[1]

بہرِ نذرِ آستانت از عجم آوردہ ام
سجدۂ شوقے کہ خوں گردید در سیمائے من[2]

تا بروید لالۂ آتش نژاد از خاکِ شام
بازسیرابش ز خونابِ مسلماناں کردہ اند[3]

---

[1] مکاتیب اقبال ص۳۱ ۔ دُوسرا مصرع کسی ایرانی شاعر کا ہے ۔
[2] پیامِ مشرق میں اس شعر کا پہلا مصرع یُوں ہے ؂
بہرِ دہلیزِ تو از ہندوستاں آوردہ ام
[3] مکاتیب اقبال ص۳۴ ؛

لوحِ مزار

گماں مدار کہ انجامِ سوختن خاک است
سرشتِ عشق ز آمیزشِ فنا پاک است
نگر کہ صیدِ محبّت چہ صید گر آمد
عتابِ موت ہم از بستگانِ فتراک است
وداعِ غنچہ پیامے ز آفرینشِ گُل
گل است غنچہ کہ جیبِ حیاتِ او چاک است
دمے نواز دم و رخت ازیں چمن بستم
کہ آشیانۂ بلبل بروں ز افلاک است

نوائے بے نوا

(شبّیرؑ و جہاں آفرینی)

بیاتا ازیں انجمن بگذریم　　ازیں کاخ و کوئے کہن بگذریم

دگر خیمہ در کربلائے زنیم　　بہ ایں بے نوائے نوائے زنیم

نوائے کہ آتش کند خاک را　　نوائے کہ واسوزد افلاک را

نوائے کہ بے ساز تقدیر نیست　　نوائے کہ بے ضربِ شبّیرؑ نیست

اگر بندۂ ایں نوائے زند

چو یزداں جہاں آفرینی کُند

(روزنامہ انقلاب لاہور شبّیرؑ نمبر)

محنت

وہی لوگ پاتے ہیں عزّت زیادہ
جو کرتے ہیں دُنیا میں محنت زیادہ

اسی میں ہے عزّت خبردار رہنا
بڑا دُکھ ہے دُنیا میں بے کار رہنا

اسی سے ہے آباد نگری جہاں کی
یہ دُنیا میں بُنیاد ہے ہر مکاں کی

بڑائی بشر کو اسی سے ملی ہے
نکمّی جو گذرے وُہ کیا زندگی ہے

زمانے میں عزّت حکومت یہی ہے
بڑی سب سے دُنیا میں دولت یہی ہے

حقیقت جو محنت کی پہچانتے ہیں
اسے کیمیا سے سوا جانتے ہیں

کوئی بڑھ کے محنت سے سونا نہیں ہے
کہ اس زر کو چوری کا کھٹکا نہیں ہے

جہاں میں اگر کیمیا ہے تو یہ ہے
غریبی کے دُکھ کی دَوا ہے تو یہ ہے

ہری کھیتیاں جو نظر آ رہی ہیں
ہمیں شان محنت کی دِکھلا رہی ہیں

نہیں کرتے دُنیا میں نادان محنت
جو سمجھیں تو سونے کی ہے کان محنت

اِسی سے زمانے میں دَولت بڑھیگی ۔ جو دولت بڑھے گی تو عزّت بڑھے گی

کوئی اس کو سمجھے تو اکسیر ہے یہ ۔ بڑا بن کے رہنے کی تدبیر ہے یہ

یہ کل وہ ہے، چلتے ہیں سب کام جس سے ۔ نکلتا ہے انسان کا نام جس سے

جو محنت نہ ہوتی تجارت نہ ہوتی ۔ کسی قوم کی شان و شوکت نہ ہوتی

سہارا ہمارا تمھارا یہی ہے ۔ اندھیرے گھروں کا اُجالا یہی ہے

بڑے کام کی چیز ہے کام کرنا ۔ جہاں کو اسی کام سے رام کرنا

گڈریوں کو شاہنشہی اس نے دی ہے ۔ کو ملبس کو دُنیا نئی اس نے دی ہے

کھڑا ہے یہ سنسار محنت کی کل پر ۔ یہ سب کارخانہ ہے اِس کل کے بل پر

بناتی ہے یہ شہر نگری ، بنوں کو ۔ بساتی ہے اُجڑی ہُوئی بستیوں کو

جو ہاتھوں سے اپنے کمایا وُہ اچّھا ۔ جو ہو اپنی محنت کا پیسہ وُہ اچّھا

مری جان! غافل نہ محنت سے رہنا

اگر چاہتے ہو فراغت سے رہنا

مزدور کا خواب

مسافر رات کے چاندی کی جیب و آستیں والے
ستارے آسماں کے جن کو کہتے ہیں زمیں والے
اُٹھا کر دوش پر اپنے عروسِ شب کی محمل کو
سحر کے خوف سے اُڑتے چلے جاتے تھے منزل کو
مثالِ گیسوئے شب خامشی بھی بڑھتی جاتی تھی
صدا موجوں کی لیکن ساحلِ دریا سے آتی تھی
وُہ غافل سو رہا تھا بسترِ ریگ بیاباں پر

ہوائیں چُومتی آتی تھیں پہنا ہے سمندر کو
اُڑا سکتی نہ تھیں اس کے تنِ عُریاں کی چادر کو

ہُوئیں آنکھیں جو اعجازِ تخیّل کی تماشائی
شبِ غربت میں کی صُبحِ وطن نے جلوہ آرائی
کنارِ آبِ راوی خواب نے پہنچا دیا اُس کو
تماشا گاہِ طفلی کا سماں دِکھلا دیا اُس کو
ہُوا اک بار پھر داخل وُہ اس ٹوٹے ہوئے گھر میں

جہاں محنت ہم آغوشِ محبّت ہو کے رہتی تھی
قناعت خانہ پرورد محبّت ہو کے رہتی تھی
جہاں چرخے کی خواب آور صدا پردہ تھی آہوں کا

چاند اور شاعر

شاعر

اک رات میرے دِل میں جو کچھ آ گیا خیال
یُوں چودھویں کے چاند سے مَیں نے کیا سوال

اے چاند تجھ سے رات کی عزّت ہے لاج ہے
سُورج کا دِن کو اور ترا شب کو راج ہے

تُو نے یہ آسمان کی محفل سجائی ہے
تو نے زمیں کو نور کی چادر اُڑھائی ہے

تو وُہ دِیا ہے جس سے زمانے میں نُور ہے
ہے تُو فلک پہ، نُور ترا دُور دُور ہے

پھیکی پڑی ہوئی ہے ستاروں کی روشنی
گویا کہ اس چمن پہ خزاں کی ہَوا چلی

تیری چمک کے سامنے شرما گئے ہیں یہ
تیری ہوا بندھی ہے تو مُرجھا گئے ہیں یہ

اس وقت تیرے سامنے سُورج بھی مات ہے
دُولھا ہے تو نجُوم کی محفل برات ہے

پائی ہے چاندنی یہ کہاں سے بتا مُجھے
یہ نور یہ کمال کہاں سے مِلا تُجھے؟

مُجھ کو بھی آرزُو ہے کہ ایسا کمال ہو
تیری طرح کمال مرا بے مثال ہو

روشن ہو میرے دم سے زمانہ اِسی طرح
دُنیا میں اپنا نام نکالوں تری طرح

حاصل کروں کمال بنوں چودھویں کا چاند
تُو ہے فلک کا چاند، بنوں مَیں زمیں کا چاند

ہر ایک کی نظر میں سماؤں اِسی طرح
شُہرت کے آسمان پہ چمکوں اِسی طرح

چاند

میرا سوال سُن کے کہا چاند نے مجُھے
لے بھید اپنے نُور کا کہتا ہُوں مَیں تجُھے

سُورج اگر نہ ہو تو گزُارا نہیں مرا
مانگا ہُوا ہے نور یہ اپنا نہیں مرا

سورج کے دم سے مُجھ کو یہ حاصل کمال ہے
کامل اسی کے نُور سے میرا ہلال ہے

پھرتا ہوں روشنی کی تمنّا میں رات دن

رہتا ہُوں مَیں کمال کے سَودا میں رات دِن

مُجھ کو اُڑائے پھرتی ہے خواہش کمال کی

کر پیروی جہان میں میری مثال کی

بے فائدہ نہ اپنے دِنوں کو خراب کر

میری طرح تلاش کوئی آفتاب کر

کہتے ہیں جس کو عِلم وُہ اِک آفتاب ہے

یکتا ہے بے مثال ہے اور لاجواب ہے

ایسے کمال کی ہے تمنّا اگر تجُھے

تُو نُور جا کے مانگ اسی آفتاب سے

ہے چاند کے کمال کو خطرہ زوال کا

رہتا ہے ہر گھڑی اُسے دھڑکا زوال کا

محفوظ اِس خطر سے ہُنر کا کمال ہے
گھٹنے کا اس کو ڈر ہے نہ خوفِ زوال ہے

دُنیا میں زندگی کا نہیں اعتبار کچُھ
رہتی ہے اِس چمن میں ہمیشہ بہار کچُھ

انساں کو فکر چاہیئے ہر دم کمال کی
"کسبِ کمال کُن کہ عزیزِ جہاں شوی"

قطعات

گفتند دل آزاد کہ پر بستہ نکوتر   گفتم کہ ز بندِ دو جہاں رستہ نکوتر

گفتند ز خلوت کدۂ خویش بروں تافت   گفتم شررِ جستہ ز ناجستہ نکوتر

گفتند کہ دربارۂ دو چیز دگر گو

گفتم چو گل از بادِ صبا خستہ نکوتر

(ماہنامہ مرقع لکھنؤ جنوری ۱۹۲۶ء)

تا بتن مثلِ گہر بر خویشتن پیچیدہ بہ   چشمہ زارِ زندگانی از نظر پوشیدہ بہ

زندگی بحرِ پر آشوب است و زن پایابِ او   موج و گردابش نگہ پایاب او نادیدہ بہ

آشکارائی ز سرِّ آفرینش دوری است

زانکہ حفظِ جوہرِ ہر خالق از مستوری است

(ماہنامہ نورجہاں امرتسر دسمبر ۱۹۲۵ء)

مدینے کی خاک

قطرے کے منہ سے نام جو تیرا نکل گیا

بادل سے گر کے رُوئے ہَوا پر سنبھل گیا

عظمت ہے خاص پاک مدینے کی خاک کو

خورشید بھی گیا تو وہاں سر کے بل گیا

دہر کی شانِ بقا خطّۂ کشمیر میں دیکھ

باغِ جنّت کی ہَوا خطّۂ کشمیر میں دیکھ

ذرّے ذرّے میں ہے اِک حُسن کا طُوفان بپا

ہوش میں لُطفِ خُدا خطّۂ کشمیر میں دیکھ

تماشائے ڈل کُن بہ ہنگامِ شام ۔۔۔ دہد شعلہ را آشیاں زیرِ آب

بشوید ز تن تا غبارِ سفر ۔۔۔ زند غوطہ در آبِ ڈل آفتاب

سکوتِ شام

لبریز ہے سرود سے تیرے سکُوتِ شام

طائر کہاں ہے ایک طلسمِ نوا ہے تُو

انساں کی ہے جو شام وہ تاروں کی ہے سحر

خوابیدہ ہیں نجُوم اذاں کی صدا ہے تُو

اصغؔر گونڈوی مرحوم نے اپنے دُوسرے مجموعۂ کلام میں اپنی ایک فارسی غزل کے بعد یہ شذرہ لکھا ہے :-

"یہ غزل قیام لاہور کے زمانے میں لکھی گئی تھی ۔ علاّمہ سر اقبالؔ نے اسے سُن کر بہت پسند فرمایا۔ اور خود بھی دو شعر اسی وقت موزوں کر کے دیئے۔ اور ہدایت فرمائی کہ انھیں اپنی غزل کے ساتھ رکھنا ۔ وہ دو شعر یہ ہیں ؎

چشمِ آدم آنسوئے افلاک نورش ہم نیافت — از خیالِ مہر و مہ اندیشہ گرد آلود بُود

من درُونِ سینۂ خود سومناتے ساختم — آستانِ کعبہ را دیدم جبیں فرسُود بُود

۱۹۱۷ء میں مسز سروجنی نائیڈو نے اپنی نظموں کا مجموعہ Broken Wing (پرشکستہ) اقبالؔ کو بھیجا تھا۔ اقبالؔ نے اس کے مطالعہ کے بعد اپنے تأثرات کا اظہار ذیل کے اشعار میں کیا جو اگست ۱۹۱۷ء کے "مرقع" لکھنؤ میں شائع ہوئے:

یارب از غارت گل بر دلِ نرگس چہ گذشت
دستِ بے طاقت وچشمِ نگرانست اُورا

شبنم ولالہ وگل اشک نِگہ آلودش
گریہ بر محنتِ خونیں جگرانست اُورا

خیز و پرزن کہ دریں جلوہ گہِ نکہت ورنگ
طائرِ نیست کہ پرواز گرانست اُورا

متروکاتِ بانگِ درا

ہمالہ

جب یہ نظم پہلی مرتبہ شائع ہوئی تو اس کے بارہ بند تھے۔ بانگِ درا کی ترتیب
کے وقت اس کے بعض بند حذف ہو گئے۔ بعض میں کچھ ترمیم ہوئی۔ اور
بعض مصرعے آگے پیچھے کر دیے گئے۔ متروکہ بند یہ ہیں :-

وُہ اُچھالی پنجۂ قدرت نے گیند اِک نُور کی
جھانکتا ہے وُہ درختوں کے پرے خورشید بھی
دِل لگی کرتی ہے ہر پتّی سے جس کی روشنی
میرے کانوں میں صدا آئی مگر کُچھ اَور ہی
دِل کی تاریکی میں وُہ خورشید جاں افروز ہے
شمعِ ہستی جس کی کرنوں سے ضیا اندوز ہے
وُہ اصُولِ حق نمائے نفسِ ہستی کی صدا

رُوح کو ملتی ہے جس سے لذّتِ آبِ بقا
جس سے پردہ رُوئے قانونِ محبّت کا اُٹھا
جس نے اِنساں کو دیا رازِ حقیقت کا پتا
تیرے دامن کی ہواؤں سے اُگا تھا یہ شجر
بیج جس کی ہند میں ہے چین و جاپاں میں ثمر
تُو تو ہے مُدّت سے اپنی سرزمیں کا آشنا
کچھ بتا اُن رازدارانِ حقیقت کا پتا
تیری خاموشی میں ہے عہدِ سلف کا ماجرا
تیرے ہر ذرّے میں ہے کوہِ المپس کی فضا
ایک جلوہ تھا کلیمِ طُورِ سینا کے لیے
تُو تجلّی ہے سراسر چشمِ بینا کے لیے[1]

---

[1] اس شعر کو پہلے بند کی ٹیپ بنا کر اس شعر کی جگہ رکھا گیا ہے ؎
تیری ہستی پر نہیں بادِ تغیّر کا اثر — خندہ زن ہے تیری شوکت گردشِ ایّام پر

آنکھ اے دل کھول اور نظّارۂ قدرت کو دیکھ

اِس فضا کو، اس گُل و گلزار کی رنگت کو دیکھ

اپنی پستی دیکھ اور اس کوہ کی رفعت کو دیکھ

اِس خموشی میں سرورِ گوشۂ عزلت کو دیکھ

شاہدِ مطلب ملے جِس سے وُہ ساماں ہے، یہی

دردِ دل جاتا رہے جس سے وہ درماں ہے یہی

(مخزن بابت اپریل سنہ ۱۹۰۱ء)

گُلِ رنگیں

اس نظم کے چھ بند تھے ۔ بانگِ درا میں یہ دو بند شامل نہیں ۔ باقی نظم میں بھی خاصی ترمیم ہوئی ہے ۔

آہ اے گُل! تجھ میں بھی جوہر وہی مستور ہے
جو دلِ انساں میں مضمر مثلِ موجِ نُور ہے
میری صورت تُو بھی اک برگِ ریاضِ طُور ہے
ہائے پھر مجُھ سے جُدائی کیوں تجھے منظور ہے
دِل میں کُچھ آتا ہے لیکن مُنہ سے کہہ سکتا نہیں
اور تکلیفِ خموشی کو بھی سہ سکتا نہیں
بھا گئے انداز تیرے اے گُلِ رعنا مجُھے

مار ڈالے گا خوشی سے جھومنا تیرا مجھے

کیوں نہیں ملتی یہ تسکینِ قرار افزا مجھے

ہاں سکھا دے کچھ سبق اپنی خموشی کا مجھے

باغِ ہستی میں پریشاں مثلِ بُو رہتا ہوں میں

زخمیٔ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

(مخزن مئی سنہ ۱۹۰۱ء)

عہدِ طفلی

یہ نظم بانگِ درا میں موجود تو ہے۔ مگر مرقومہ ذیل دو بند ابتدائی اور ایک آخری اس میں شامل نہیں۔

ہاں اُٹھا اے ساحرِ ایّام! یہ جادُو ذرا
ابلقِ گردوں نہ ہو محوِ رمِ آہُو ذرا
ہائے پھر آجا کہیں سے عُمرِ رفتہ! تُو ذرا
لا وہ نظّارا پئے چشمِ تماشا جُو ذرا
خون رُلواتے ہیں ایّامِ جوانی کے مزے
لا کہیں سے پھر وُہی ایّامِ طفلی کے مزے
ہائے وُہ عالم کہ عالم گیر تھی اپنی ادا
غیرتِ صد فصلِ گُل تھی اپنے گُلشن کی ہوا

مکتبِ طفلی میں غیر از درسِ آزادی نہ تھا

زنگِ افکارِ جہاں سے شیشۂ دِل تھا صفا

مایہ دارِ صد مسرّت اِک تبسّم تھا مرا

گوشِ دِل لگ جائیں جس پر وُہ تکلّم تھا مرا

آہ ! اے دُنیا نمک پاشِ خراشِ دِل ہے تُو

جس کے ہر دانے میں سَو بجلی ہوں وہ حاصل ہے تُو

جو مسافر سے پرے رہتی ہے وہ منزل ہے تُو

جس کی لیلیٰ مایۂ وحشت ہو وُہ محمل ہے تُو

تیرے ہاتھوں کوئی جویائے مےِ تسکیں نہ ہو

ایمن از مارِ زمینِ گُلستاں گُل چیں نہ ہو

(مخزن - جولائی ۱۹۰۱ء)

مرزا غالب

اس نظم کے پانچ بندوں میں سے نظر ثانی کے وقت یہ دوسرا بند حذف کر کے
اس کی جگہ نیا بند لکھا گیا۔

معجزِ کلکِ تصوّر ہے یا دیواں ہے یہ
یا کوئی تفسیرِ رمزِ فطرتِ انساں ہے یہ
نازشِ موسیٰ کلامی ہائے ہندوستاں ہے یہ
نورِ معنی سے دل افروزِ سخنداناں ہے یہ
"نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

مخزن ستمبر ۱۹۰۱ء

ابرِ کوہسار

دس بند کی اس نظم سے بانگ درا میں صرف چار بند رکھے گئے - باقی یہ ہیں :-

غنچۂ گل مرے سائے سے چٹک جاتا ہے اخترِ قسمتِ گلزار چمک جاتا ہے

میرا ہر قطرہ گلستاں پہ پھڑک جاتا ہے دلِ بُلبل کی طرح گل سے اٹک جاتا ہے

سبزۂ مزرعِ نوخیز کی امید ہوں مَیں

زادۂ بحر ہُوں پروردۂ خورشید ہُوں مَیں[1]

ہے مجھے دامنِ کہسار میں سُننے کا مزا نغمۂ دخترِ دوشیزۂ دہقاں کی صدا

---

[1] یہ شعر تیسرے بند کی ٹیپ بنا دیا گیا ہے - پہلے ٹیپ کا شعر یہ تھا ؎

دل لگی کوہ کے چشموں سے مُجھے بھاتی ہے

زندگی اپنی اسی طرح گذر جاتی ہے

وہ سرِ کوہ سے تھم تھم کے اُترنا اس کا
حشر ڈھاتی ہے یہ آہستہ خرامی کی ادا

سر پہ وُہ دودھ کی ٹھلیا کو اُٹھاتے آنا
اور وُہ تھم تھم کے اُترتے ہُوئے گاتے آنا

قدم اپنا جو سوئے شہر و دیار اُٹھتا ہے
شیشۂ خاطرِ محزوں سے غبار اُٹھتا ہے

کوئی کہتا ہے کہ وُہ ابرِ بہار اُٹھتا ہے
اور کوئی جوشِ طرب میں یہ پکار اُٹھتا ہے

"تند و پُر شور و سیہ مست ز کہسار آمد
مے کشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد"

میری عادت میں ہے اِک شور مچاتے آنا
سرِ کہسار سے طنبور بجاتے آنا

چھیڑ سے باغ میں کلیوں کو ہنساتے آنا
شکوہ ہائے ستم مہر سناتے آنا

توسنِ باد پہ اُڑتا ہوُا آتا ہُوں مَیں
گرمیٔ مہر کے کُشتوں کا مسیحا ہُوں مَیں

وہ ضیا گسترِ عالم، وُہ عروسِ زیبا
نام انسان کی بولی میں قمر ہے جس کا

اُٹھ گیا موجِ ہوا سے کبھی دامن جو مرا　　ہو گیا عارضِ خاتونِ فلک بے پردا

نظر آتے ہی مگر پردہ نشیں چھپتے ہیں
رُوئے تاباں کی جھلک دیکھ حسیں چھپتے ہیں

کی ذرا دست درازی جو ہوا نے مجھ پر　　چاک دامن سے دمکتے نظر آئے اختر
مجھ سے چلنے میں نہ ہوگا کوئی غافل بڑھکر　　گر پڑے ہیں مرے دامن کی گرہ کھل کے گُہر

مقصدِ ہر صدفِ قلزمِ ذخّار ہوں میں
ابرِ رحمت ہوں گہردار، گُہربار ہوں میں

(مخزن نومبر ۱۹۰۱ء)

پرندے کی فریاد

ابتدا میں اس نظم کے بیس شعر تھے - مندرجہ ذیل شعر کتر بیونت کا

شکار ہوئے :-

آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ — وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ

وہ ساتھ سب کے اُڑنا وہ سیر آسماں کی — وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا مل کے گانا

پتّوں کا ٹہنیوں پہ وہ جھومنا خوشی سے — ٹھنڈی ہوا کے پیچھے وہ تالیاں بجانا

تڑپا رہی ہے مجھ کو رہ رہ کے یاد اسکی — تقدیر میں لکھا تھا پنجرے کا آب و دانا

اس قید کا الٰہی دُکھڑا کسے سناؤں

ڈر ہے یہیں قفس میں، مَیں غم سے مر نہ جاؤں

باغوں میں بسنے والے خوشیاں منا رہے ہیں — مَیں دل جلا اکیلا دُکھ میں کراہتا ہوں

ارمان ہے، یہ جی میں اُڑکر چمن میں جاؤں　　ٹہنی پہ گُل کی بیٹھوں آزاد ہو کے گاؤں

بیری کی شاخ پر ہو ایسا ہی پھر بسیرا　　اس اُجڑے گھونسلے کو پھر جا کے میں بساؤں

چُگتا پھروں چمن میں دانے ذرا ذرا سے　　ساتھی جو ہیں پُرانے اُن سے ملوں ملاؤں

پھر دن پھریں ہمارے پھر سیر ہو وطن کی

اُڑتے پھریں خوشی سے کھائیں ہوا چمن کی

آزاد رہ کے جس نے دن اپنے ہوں گذارے　　اس کو بھلا خبر کیا یہ قید کیا بلا ہے

مخزن - فروری ۱۹۰۷ء

خفتگانِ خاک سے استفسار

اس نظم کے تینوں بندوں میں سے مندرجہ ذیل شعر حذف کر کے بعض شعر نئے لکھے گئے۔ بعض میں ضروری ترمیم ہوئی۔

(۱)

کھیت سے آتا ہے دہقاں منہ میں کچھ گاتا ہوا

پائے گرد آلود دیتے ہیں مسافت کا پتا

کام دھندا ہو چکا اب نیند ہے آرام ہے

ہائے وُہ آغاز محنت جس کا یہ انجام ہے

رات کی آمد ہے مُرغانِ ہوا خاموش ہیں

ابتدا اور انتہا آپس میں ہم آغوش ہیں

شورشِ گفتارِ انساں کی صدا آتی نہیں

وُہ صدائے نغمۂ گوش آشنا آتی نہیں

(۲)

اے عدم کے رہنے والو تم جو یُوں خاموش ہو

مے وہ کیسی ہے ؟ نشے میں جسکے تم مدہوش ہو ؟

وُہ ولایت بھی ہمارے دیس کی صُورت ہے کیا

شب وہاں کی کیا ہے صُبح و شام کی رنگت ہے کیا ؟

دِل میں ہوتے ہیں اسی صورت سے پیدا ولولے

اس ولایت میں بھی کیا مجبُور کہتے ہیں اسے

واں بھی آزارِ غریبی سے کبھی روتے ہیں کیا

اس ولایت میں بھی دِل ٹُوٹے ہوئے ہوتے ہیں کیا

یہ خوشامد اس ولایت کا بھی کیا دستور ہے

واں بھی کیا سنگِ ریا سے شیشۂ دِل چُور ہے

واں کی عزّت بھی حکومت بھی حباب آسا ہے کیا

واں بھی یہ دولت ہی پیمانہ شرافت کا ہے کیا

آہ اس کشور میں تو جوہر کی عزّت کچھ نہیں

واں کی نگری میں بھی اس موتی کی قیمت کچھ نہیں

خرمنِ دہقاں کو ہے بجلی کا ڈر ایسا ہی کیا؟

اس جہاں میں ہے تبسّم پُر خطر ایسا ہی کیا؟

فکر اینٹوں کی وہاں بھی ہے مکاں کے واسطے

تنکے چُنتے ہیں وہاں بھی آشیاں کے واسطے

(۳)

اِس جُدائی میں نہفتہ وصل کا ساماں ہے کیا

چشم بستہ سرمۂ گوہر پئے انساں ہے کیا

اِس نگر کی طرح کیا واں بھی ہے رونا موت کا

کیا وہاں کی زندگی کو بھی ہے کھٹکا موت کا؟

یاں تو چلمن کی جھلک سے اور بڑھ جاتا ہے شوق

کیا وہاں پہ جلوۂ بے پردہ دکھلاتا ہے شوق؟

حُسن و خوبی ہو کے بے پردہ نظر آتے ہیں کیا

اس جہاں میں عشق کے ارماں نکل جاتے ہیں کیا؟

بے نشاں ہے جس کی ہستی وہ اسی ہستی میں ہے

جس کو کہتے ہیں بلندی وُہ اسی پستی میں ہے

ہم جسے کہتے ہیں ہستی ہے وُہ کیا تفسیرِ حُسن؟

ہے صداقت بھی سعادت بھی وہاں تصویرِ حُسن؟

(مخزن - فروری ۱۹۰۲ء)

شمع و پروانہ

اس نظم کے بارہ شعروں میں سے دوسرا، چھٹا، آٹھواں اور نواں
بانگِ درا میں شامل نہ کیئے گیۓ ۔

وُہ بات تجھ میں کیا ہے کہ یہ بیقرار ہے
جاں در ہوائے لذّتِ خوابِ مزار ہے

بے اختیار سوز سے تیرے بھڑک اُٹھا　　قسمت کا اپنی بنکے تارا چمک اُٹھا

تھوڑی سی روشنی پہ فدا ہو رہا ہے یہ
اِک نُور ہے کہ جِس میں فنا ہو رہا ہے یہ

پروانہ کیا ہے اک دلِ ایذا طلب ہے یہ
عینِ وصال و سوزِ جُدائی غضب ہے یہ

(مخزن - اپریل سنہ ۱۹۰۲ء)

صدائے درد

نظرِ ثانی میں اس نظم کے مندرجہ ذیل اشعار حذف کئے گئے :۔

اے ہمالہ! تُو چھپالے اپنے دامن میں مجُھے
ہے غضب کی بے کلی اپنے نشیمن میں مجھے

مُدّتیں گزُری ہیں مجُھ کو رنج و غم سہتے ہوئے
شرم سی آتی ہے اب اس کو وطن کہتے ہوئے

آہ ویرانی ہے پنہاں یاں کی ہر تعمیر میں
آشیاں اور اس گلُستاں خزاں تاثیر میں

آشیاں ایسے گلستاں میں بناؤں کس طرح
اپنے ہم جنسوں کی بربادی کو دیکھوں کس طرح

پھر بُلا لے مجُھ کو اے صحرائے وسطِ ایشیا

آہ اِس بستی میں اب میرا گزُارا ہو چُکا

پار لے چل مُجھ کو پھر اَے کشتیٔ موجِ اٹک

اب نہیں بھاتی یہاں کے بوستانوں کی مہک

ہاں سلامِ آخری اَے مولدِ گوتم تجھے

اب فضا تیری نظر آتی نہیں محرم مجُھے

الوداع اے مدفنِ ہجویریؒ اعجاز دم

رُخصت اے آرام گاہِ شنکرِ جادُو رقم

الوداع اے سیرگاہِ شیخ شیراز الوداع

اے دیارِ بالمیکِ نکتہ پرداز الوداع

الوداع اے سرزمینِ نانکِ شیریں بیاں

رُخصت اے آرام گاہِ چشتیؒ عیسےٰ نشاں

رمزِ اُلفت سے مرے اہلِ وطن غافل ہوئے

کارزارِ عرصۂ ہستی کے ناقابل ہوئے

اپنی اصلیّت سے ناواقف ہیں کیا انساں ہیں یہ

غیر اپنوں کو سمجھتے ہیں عجب ناداں ہیں یہ

جس کا اِک مُدّت سے دھڑکا تھا وُہ دِن آنیکو ہے

صفحۂ ہستی سے اپنا نام مٹ جانے کو ہے

دِل حزیں ہے جاں رہینِ رنج بے اندازہ ہے

آہ اک دفتر تھا اپنا ، وُہ بھی بے شیرازہ ہے

امتیازِ قوم و ملّت پہ مٹے جاتے ہیں یہ

اور اس اُلجھی ہوئی گُتھّی کو اُلجھاتے ہیں یہ

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی

کچُھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی

رُوح کا جوبن نکھرتا ہے اِسی تدبیر سے

"آدمی سونے کا بن جاتا ہے اس اکسیر سے"

رنگِ قومیّت مگر اس سے بدل سکتا نہیں

خونِ آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں

وصلِ محبوبِ ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی

اک بیاضِ نظمِ ہستی کی ہیں تدبیریں سبھی

ایک ہی مے سے اگر ہر چشمِ دل مخمُور ہے

یہ عداوت کیوں ہماری بزم کا دستُور ہے

(مخزن۔ جُون ۱۹۰۲ء)

شمع

اس نظم کے حذف شدہ اشعار یہ ہیں:۔

ان اشکباریوں میں طہارت کا راز ہے

کیسا وضُو ہے یہ کہ سراپا نماز ہے

ایذا پسند ہے دلِ اندوہ گیں ترا

کچھ تجھ پہ رازِ غمکدۂ دہر کھُل گیا

"از مہر تا بہ ذرّہ دل و دیں ہے آئنہ

طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئنہ"

سمجھے کہ خامشی ہے مآلِ ضیائے شمع
اے وائے گفتگوئے لبِ بے صدائے شمع

خورشید شب ہے جلوۂ ظلمت رُبا ترا
تجھ کو بھی ہے خبر کہ یہ ہے چاندنا ترا

جلتی اسی شرار سے ہے شمعِ ماسوا ساماں طرازِ ظلمتِ شب ہے یہ چاند نا

آزاد دستبردِ بقا و فنا ہوں میں کشتہ ہو یہ شرار تو کیا جانے کیا ہوں میں

جوں نے کمندِ نالۂ دل ہیں اسیر ہوں فرقت میں نیستاں کی سراپا نفیر ہوں

محمودؔ اپنے آپکو سمجھا ایاز ہے کیا غفلت آفریں یہ مئے خانہ ساز ہے

دل خار زارِ کم نگہی میں اُلجھ نہ جائے

ڈرتا ہوں کوئی میری فغاں کو سمجھ نہ جائے

(مخزن۔ دسمبر سنہ ۱۹۰۲ء)

ایک آرزو

ابتدا میں اس نظم کے دو بند تھے۔ نظرِ ثانی میں پہلے بند کے پانچ شعر اور
دوسرے بند کے سارے شعر کاٹ دئے گئے جو یہ ہیں :-

پتّوں کا ہو نظّارا میری کتاب خوانی
دفتر ہو معرفت کا جو گُل کھِلا ہُوا ہو
یُوں وادیوں میں آکر ٹھہرے شفق کی سُرخی
جیسے کسی گلی میں کوئی شکستہ پا ہو
پچھم کو جا رہا ہو کچھ اِس طرح سے سُورج
جیسے کوئی کسی کے دامن کو کھینچتا ہو
ظُلمت جھلک رہی ہو اس طرح چاندنے میں
جُوں آنکھ میں سحر کی سُرمہ لگا ہُوا ہو

دل کھول کر بہاؤں اپنے وطن پہ آنسو

سرسبز جن کی نم سے بُوٹا امید کا ہو

سمجھیں مرے سخن کو ہندوستان والے

موزون ہو گئے ہیں نالے، سخن نہیں ہے

شمشاد گُل کا بیری، گُل یاسمن کا دشمن

ہو آشیاں کے قابل یہ وُہ چمن نہیں ہے

اپنوں کو غیر سمجھوں اس سرزمیں میں رہ کر

مَیں بے وطن ہوں میرا کوئی وطن نہیں ہے

وُہ مے نہیں کہ جس کی تاثیر تھی محبّت

ساقی نہیں وُہ باقی، وُہ انجمن نہیں ہے

"در محفلے کہ یاراں شربِ مدام کردند

چوں نوبتے بہ ماشد آتش بہ جام کردند"

مخزن دسمبر ۱۹۰۲ء

آفتابِ صُبح

یہ نظم جب رسالہ خدنگِ نظر لکھنؤ میں شائع ہوئی تھی تو اس کے آٹھ بند تھے۔ بانگ درا کی ترتیب کے وقت اس کے دو بند حذف کئے گئے اور ایک نئے بند کا اضافہ کیا گیا۔ حذف شدہ شعر یہ ہیں :۔

اے چراغِ آسماں ! اے آفتاب صُبحدم !
راستہ تیرا نہیں شرمندۂ نقشِ قدم !
ابر میں چُھپنا ترا لاتا ہے دِل پر ابرِ غم
یہ ادا چشمِ تماشائی پہ کرتی ہے سِتم
تُو وُہ مطلع ہے سرِ دیوانِ عالم کے لئے
خامۂ قدرت نے آبِ زر سے لکھّا ہے جسے

ہائے کس حُسنِ جہاں آرا کی ہے تجھ میں جھلک
خیرہ ہو جاتی ہے تیرے نُور سے چشمِ فلک

رُوح پرور ہے تجلّی تیری اے چشمِ فلک
جلتی جُلتی ہے چراغ طُور سے تیری چمک

خانۂ دل نُور سے معمُور ہو جائے مرا
نقطۂ دل تخمِ نخلِ طُور ہو جائے مرا

گُلِ پژمُردہ

بانگ درا میں اس نظم کے صرف چھ شعر جگہ پا سکے ہیں۔ باقی

یہ ہیں :۔

ہم سفر آخر تری بُو کی تری رنگت ہوئی

ہائے کیا تاراج تیرے حُسن کی دولت ہوئی

بُلبلِ نالاں نہ پہچانے اگر دیکھے تجھُے

ہو پشیماں عشق پہ اپنے جو پہچانے تجھُے

سرگراں سی اب شعاعِ مہرِ تاباں تجھُ سے ہے

آہ وُہ بادِ سحر بھی اب گریزاں تجھُ سے ہے

دیدۂ گُل چیں کو اب تیری ادا بھاتی نہیں

لال جوڑا اب شفق بھی تجھ کو پہناتی نہیں

شاخ تیری بارِ بُلبل سے نہ اب خم کھائے گی

آبِ گوہر سے نہ اب شبنم تجھے نہلائے گی

آہ وُہ تتلی وُہ اک معصومیت اُڑتی ہوئی

تھک کے اب پرواز سے تجھ پر نہ بیٹھے گی کبھی

وہ ذرا سا جانور دِل دادۂ آوارگی

کھینچتی تھی سوئے گُلشن جس کو شیرینی تری

گرچہ تھا صحنِ چمن میں عاشقِ شیدا ترا

اب تجھے دیکھے تو بھاگے الحذر کہتا ہوُا

میری آنکھوں کو مگر اے گُل بھلا لگتا ہے تو

آتی ہے مُجھ کو تری پژمردگی سے اپنی بُو

ہیں مرے سینے میں بھی پوشیدہ زخم بے رفو

داغ بن کر رہ اسی اُجڑے ہوئے گلشن میں تُو

لب مرا ہے بُلبل رنگیں نوا تیرے لئے
میری ٹھنڈی آہ ہے بادِ صبا تیرے لئے

موجِ دریا

اس نظم کے تین بندوں میں سے مندرجہ ذیل تیسرا بند بانگِ درا میں شامل نہیں ہے :-

غنچۂ آب ہیں گُلشن کی تماشائی ہُوں اپنی ہستی کو مٹانے کی تمنّائی ہُوں
کشتۂ عشق ہُوں محرومِ شکیبائی ہوں حوصلہ دیکھ کہ مَیں بحر کی سودائی ہُوں
زندگی جُزو کی ہے کُل میں فنا ہو جانا
"دَرد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا"

سیّد کی لوحِ تربت

جو اشعار نظرِ ثانی کے وقت قلم زد کیئے گئے، یہ ہیں :۔

(۱)

اے کہ زائر بن کے میری قبر پر آیا ہے تو
اے کہ مستانہ مۓ حسن عقیدت کا ہے تو
بس کہ ہے بادِ صبا یاں کی اخوّت آفریں
یہ وہ گلشن ہے جہاں سبزہ بھی بیگانہ نہیں
یہ وہ نظارہ ہے یاں ہر گل سراپا دیدہ ہے
اپنے گُلشن کی زمیں میں باغباں خوابیدہ ہے

(۲)

دیکھ اپنوں میں نہ پیدا ہو کہیں بے گانگی

چل نہ جائے تیرے گُلشن میں ہوَا پیکار کی

دین کے پردے میں تو دُنیا کا سَودائی نہ ہو

آڑ میں مذہب کی شوقِ عزت افزائی نہ ہو

گالیاں دینا کسی کو دین کی خدمت نہیں

یہ تعصّب کوئی مفتاحِ درِ جنّت نہیں

راہبر کو قافلے کے ساتھ رہنا چاہیئے

کیا چلے گا کارواں جب رہنما پیچھے رہے

(۳)

ہو شرابِ حُبّ قومی میں اگر سرشار تُو

ہو نہ اپنی عزّت افزائی کی تجُھ کو آرزو

قافلہ جب تک پہنچ جائے نہ منزل کے قریں

رہنما ہوتے ہیں جو رستے میں دم لیتے نہیں

کیا مزا رکھتی ہے ابنائے وطن کی فکر بھی
اس میں کچھ ہوتی نہیں اپنے کفن کی فکر بھی

دیکھ آوازِ ملامت سے نہ گھبرانا ذرا
عشق کے شُعلے کو بھڑکاتی ہے یہ بن کر ہوا

وُہ شجر ہے عشقِ اخوان، زندگی ہے جس کا پھل
قوم کے عاشق کو چھُو سکتا نہیں دستِ اجل

عالمِ عقبےٰ میں ہے سب سے بڑی عزت یہی
عشقِ اخواں میں اگر مطعون ہو جائے کوئی

عشق ہر صُورت میں تسکینِ دلِ ناشاد ہے
یہ کہیں نالہ کہیں شیون کہیں فریاد ہے

خود بخود مُنہ سے نکل جاتی ہے ایسی لے ہے یہ
شیشۂ دل سے اُچھل جاتی ہے ایسی مے ہے یہ

چوں زمینائے محبّت خوردہ بودم بادہٗ

تا ثرّیا رفت ایں قومِ نہ خاک افتادہٗ

(۴)

اپنے حق کے مانگنے میں رکھ ادب مدّ ِنظر

چاہیئے سائل کو آداب طلب مدّ ِنظر

معنیٔ رمزِ اطاعت کی نہ ہو جس کو خبر

چاہیئے دُنیا کو اس ناداں کی صُحبت سے حذر

"آب چوں در روغن افتد نالہ خیزد از چراغ

صحبتِ ناجنس باشد باعثِ آزارہا"

(۵)

چاہیئے ہو باعثِ آرامِ جاں شاعر کی لے

لاج اس جُزوِ نبوّت کی ترے ہاتھوں میں ہے

دیکھ اے جادُو بیاں تو نے اگر پروا نہ کی
آبرو گر جائے گی اس گوہرِ یک دانہ کی

"از شرابِ حُبِّ ہمجنسانِ خود مستانہ باش
شعلۂ شمعِ وطن را صورتِ پروانہ باش"

(مخزن جنوری ۱۹۰۳ء)

سوامی رام تیرتھ

اس نظم کے سات شعروں میں سے آخری شعر حذف کیا گیا:-

کیا کہوں زندوں سے مَیں اس شاہدِ مستور کی
دار کو سمجھے ہُوئے ہیں جو سزا منصُور کی

(مخزن جنوری ۱۹۰۷ء)

ماہِ نو

بانگِ درا میں اس نظم کے سات شعر شائع ہوئے ہیں۔ باقی حسب ذیل ہیں۔

شام نے آکر پڑھا دیباچۂ مضمونِ شب
ہے لبِ پیرِ فلک پر مصرعِ موزونِ شب

منشیٔ قُدرت مگر کھاکر کہیں ٹھوکر گرا
جب سیاہی گر چکی قط زن سیاہی پر گرا

کاسۂ سیمیں لئے ہاتھوں میں آیا دیکھنا
آسماں دریوزۂ ظُلمت کو نکلا دیکھنا

اے چراغِ دودمانِ آفتابِ خاوری
قہر ہے چشمِ تصوّر پہ تری جادوگری

تُو وُہ رہرو ہے کہ پھرتا ہی رہا منزل کے گرد

قیس کی صورت جبیں سا ہی رہا محمل کے گرد
سُرمۂ گوہر میری آنکھوں کو تیری دید ہے

اے مہِ نو تو ہلالِ مطلعِ امید ہے
آرزوے نور میں ہے صورتِ سیماب تو

تیری بے تابی کے صدقے ہے عجب بیتاب تو
چاہیئے میری نگاہوں کو انوکھی چاندنی

لا کہیں سے ماہ کامل بن کے ایسی چاندنی
ظلمتِ بیگانگی میرے وطن سے دور ہو

خاکِ ہندستاں کا ہر ذرّہ سراپا طور ہو

عشق اور موت

حذف شدہ اشعار

کہیں عجز سے گردنیں جھک رہی تھیں — رعونت کہیں مانعِ بندگی تھی
پتنگا کہیں مستِ ذوقِ تپیدن — کہیں شمع کو نازشِ دلبری تھی
جو قمری کو ملتا تھا طوقِ غلامی — صنوبر کو انعام، آزادگی تھی
یہ گرمِ فغاں تھی وہ محوِ تبسّم — جو بلبل کا غم تھا وہ گل کی خوشی تھی

وہ دردِ محبّت وُہ ایمانِ ہستی — وہ افشانِ حسنِ ازل کا ستارا
سرِ کوہ چمکے جو وُہ بن کے تجلی — تو ہو غیرتِ طور پہ سنگِ خارا

(مخزن نومبر ۱۹۰۲ء)

زہد اور رندی

اس نظم کے یہ تین شعر کانٹ چھانٹ کا شکار ہوئے :۔

وہ نذر تو فرماتے تھے ہو کر متبسّم

دینداروں کی امداد ہے ایماں کی نشانی

کہتے ہیں کہ ہے اس کو محبّت فقراء سے

دیکھی نہیں ہم نے تو کوئی اس کی نشانی

ہر رات اسے راگ کے جلسوں سے سروکار

پھرتا ہے سرِ مزرعِ اوراد یہ پانی

(مخزن دسمبر ۱۹۰۳ء)

رُخصت اَے بزمِ جہاں

نظرِ ثانی میں اس نظم کے یہ شعر حذف کیئے گئے :-

تیر لگتی ہے نگاہِ چشمِ نو دولت مُجھے
ہے ترے عجزِ خوشامد زادہ سے نفرت مُجھے

مدّتوں ضبطِ تکلّم کے ستم سہتا رہا
اشک کی صُورت میں اپنا حالِ دِل کہتا رہا

خامشی کا بار لیکن اب اُٹھا سکتا نہیں
آئینہ مشرب ہوں راز اپنا چُھپا سکتا نہیں

(۲)

مل کے رہتی ہیں تہ دامانِ دریا مچھلیاں
یعنی وہ چاندی کے طائر بے پر و بے آشیاں

مل کے اُڑتے مل کے گاتے ہیں گلستاں کے طیور

خیمہ زن انسان ہیں شہروں میں ویرانوں سے دُور

(۳)

کوہ کے دامن میں کیا بے مُدّعا پھرتا ہوں مَیں

کیا مصافِ زندگی سے بھاگتا پھرتا ہوں مَیں

(مخزن مارچ ۱۹۰۴ء)

جُگنو

اس نظم کے دوسرے بند کا یہ شعر قلم زد کیا گیا :-

اک مشتِ گل میں رکھّا احساس کا شرارہ

انسان کو آگہی کیا ظُلمت کو چاندنی دی

(مخزن دسمبر ۱۹۰۴ء)

طفلِ شیر خوار

اس نظم سے مندرجہ ذیل شعر حذف کیۓ گئے :۔

ایسی چیزوں کو جو تُو سمجھا ہے سامانِ خوشی
کیا کسی دُکھ درد کے مکتب کی ابجد ہے یہی

درد سے اے نو اسیرِ حلقۂ گردابِ درد
ہوتی جائے گی تجھے آگاہی اسبابِ درد

اس چمکتی چیز کی خاطر یہ بیتابی ہے کیا؛
اب سیاہی کے گرانے کی تجھے سُوجھی ہے کیا

ہے تجھے کچھ فرش پر اس کے گرانے کا مزا
ٹوٹ جائے آئنہ میرا تجھے پروا ہے کیا

تالیوں کا ہو کوئی گچھا کہ سونے کی گھڑی
مِل گئی جو شے تجھے تیرا کھلونا بن گئی

جو تری آنکھوں کے آگے ہو۔ ہوس انگیز ہے
یعنی ہر شے توسنِ ادراک کو مہمیز ہے

پھوٹتی ہے فصلِ گُل کی جس طرح پہلے کلی
منہ پہ ڈالے سبز پتّی کی نقابِ عارضی

یوں ترے ہنسنے سے دل میں ہے تمنّا کی نمود
اے گلِ نشگفتۂ صحنِ چمن زارِ وجود

تیرا آئینہ تھا آزادِ غبارِ آرزو
وصلِ ہستی سے چمک اُٹھا شرارِ آرزو

(مخزن فروری ۱۹۰۴ء)

تصویرِ درد

یہ نظم ۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت اسلام کے اُنیسویں سالانہ جلسے میں پڑھی گئی۔ اسکے دس بند تھے۔ بانگِ درا کی ترتیب کے وقت تیسرا اور ساتواں دو بند بالکل حذف کر دئے گئے۔ باقی بندوں سے بھی کئی شعر کٹ گئے۔ نواں اور دسواں بند جوں کے توں رہے :-

(۱)

ہوئی ہے سرمۂ آواز گو لذّت خموشی کی
نگہ بن بن کے آنکھوں سے نکلتی ہے فغاں میری
مری حیرت روانی سوز ہے اس درجہ اے ساقی
کہ مینا بن گئی آخر شرابِ ارغواں میری

شکارِ خوفِ رُسوائی ہے میری نوگرفتاری

کسی صورت ہو یارب ساری دُنیا راز داں میری

(۲)

شکایت آسماں کی میرے لب پر آ نہیں سکتی

مَیں حرفِ زیرِ لب شرمندۂ گوشِ سماعت ہوں

مری ہستی نے آلودہ کیا دامانِ عصیاں کو

وہ عاصی ہوں کہ مَیں اپنے گناہوں کی ندامت ہوں

مرے طوفِ جبیں کو اُڑ کے خاکِ آستاں آئی

مَیں وہ درماندۂ دامانِ صحرائے عبادت ہوں

سیہ کاری مری زاہد سے کہتی ہے یہ محشر میں

سبھی کچھ ہوں مگر ہم رنگِ محرابِ عبادت ہوں

مری ہستی نہیں، وحدت میں کثرت کا تماشا ہے

کہ خود عاشق ہوں خود معشوق ہوں خود دردِ فرقت ہوں

وضو کے واسطے کعبہ لئے آتا ہے زمزم کو

الٰہی کون سی وادی میں ہیں محوِ عبادت ہوں

نہ چھُپ او کاٹنے والے مجھے میرے نیستاں سے

سراپا صورتِ نے تیری فُرقت کی شکایت ہوں

نجف میرا مدینہ ہے مدینہ ہے مرا کعبہ

میں بندہ اور کا ہوں اُمّتِ شاہِ ولایت ہوں

جو سمجھوں اور کچھ خاکِ عرب میں سونے والے کو

مجھے معذور رکھ میں مستِ صہبائے محبّت ہوں

یہی صہبا ہے جو رفعت بنا دیتی ہے پستی کو

اسی صہبا میں آنکھیں دیکھتی ہیں رازِ ہستی کو

(۳)

شرابِ عشق میں کیا جانے کیا تاثیر ہوتی ہے
کہ مشتِ خاک جس سے رُوکشِ اکسیر ہوتی ہے

یہ وُہ مے ہے تکلّم بن کے رہتی ہے زبانوں میں
نگاہوں میں مثالِ سُرمۂ تسخیر ہوتی ہے

زباں میری ہے لیکن کہنے والا اور ہے کوئی
مری تقریر گویا اور کی تقریر ہوتی ہے

بس اے ذوقِ خموشی! رخصتِ فریاد دے مجھکو
کہ چپ بیٹھوں تو گویائی گریباں گیر ہوتی ہے

اثر ایسا کیا ہے دل پہ تاراجِ گلستاں نے
مجھے پروازِ رنگِ گُل صدائے تیر ہوتی ہے

سُنا ہے میں نے جو کچھ اہلِ محفل کو سُناتا ہوں

خموشی بے محل مثلِ دمِ شمشیر ہوتی ہے

نفس کا آئینہ باندھا ہوا ہے مَیں نے آہوں میں
مری ہر بات میرے درد کی تصویر ہوتی ہے

خود اپنے آنسوؤں میں رونے والا چھپ کے بیٹھا ہو
صدائے نالۂ دل کی یہی تاثیر ہوتی ہے

تمیزِ ما و من ہوتی نہیں حرفِ محبّت میں
مثالِ خامشی گویا مری تقریر ہوتی ہے

سُنے ہیں اہلِ محفل نے فسانے حال و ماضی کے
مرے نالوں میں استقبال کی تفسیر ہوتی ہے

بُرا ہوں یا بھلا ہُوں میرا کہنا سب کو بھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

---

(۴)

ہوائے امتیازِ ملّت و آئیں کی موجوں نے

غضب کا تفرقہ ڈالا ترے خرمن کے دانوں میں

جہاں خوں ہو رہا ہے کارزارِ زندگانی سے

مئے غفلت کے ساغر چل رہے ہیں نوجوانوں میں

تغیّر اس طرح کا محفلِ ہستی میں آیا ہے

کہ ہے چُپ بیٹھ رہنا بھی تباہی کے نشانوں میں

مزہ دیتا نہیں کچھ صورتِ گُل صد زباں ہونا

زباں جب ایک بھی گویا نہ ہو اتنی زبانوں میں

ہوا پیکار کی آخر اُجاڑے گی گلستاں کو

خُدا رکھّے یہ ہے اپنے پُرانے مہربانوں میں

قیامت ہے کہ ہر ذرّے سے پیدا سو مصیبت ہے

زمیں بھی اپنی شاید جا ملی ہے آسمانوں میں

اڑا لے جائے گی موجِ ہوائے نیستی ان کو

نہ ہو جب راہ پیمائی کی طاقت ناتوانوں میں

رُلایا خُوں مری آنکھوں کو تیرے خوابِ غفلت نے

مری تقدیر میں لکھا تھا رونا کلکِ قُدرت نے

(۵)

دِکھادُوں گا میں اے ہندوستاں رنگِ وفا سب کو

کہ اپنی زندگانی تجھ پہ قربان کر کے چھوڑوں گا

نہیں بے وجہ وحشت میں اُڑانا خاکِ زنداں کا

کہ میں اس خاک سے پیدا بیاباں کر کے چھوڑوں گا

شریکِ محنتِ زنداں ہُوں گو یُوسف صفت خود بھی

مگر تعبیرِ خوابِ اہلِ زنداں کر کے چھوڑوں گا

ابھی مجھ دِل جلے کو ہم صفیرو! اور رونے دو
کہ میں سارے چمن کو شبنمستاں کر کے چھوڑوں گا

تعصّب نے مری خاکِ وطن میں گھر بنایا ہے
وہ طوفاں ہوں کہ مَیں اس گھر کو ویراں کر کے چھوڑوں گا

اگر آپس میں لڑنا آج کل کی ہے مسلمانی
مسلمانوں کو آخر نامسلماں کر کے چھوڑوں گا

اٹھادوں گا نقاب عارضی محبوب یک رنگی
تجھے اس خانہ جنگی پر پشیماں کر کے چھوڑوں گا

جو تیرا درد تھا تاکا ہے اُسنے میرے پہلو کو
تری اُفتاد نے توڑا ہے میرے دستِ بازو کو

(۶)

اُڑا کر لے گئی لذّت تجھے آوارہ رہنے کی

چمن میں کچھ نہ دیکھا صورتِ بادِ صبا تُو نے

تری تعمیر میں مضمر ہوئی افتادگی کیوں کر

لگائی ہے مگر اس گھر کو خشتِ نقشِ پا تُو نے

تلاشِ تکمہ اخگر سے پیدا ہے جنوں تیرا

جو پہنی صورتِ تصویر کاغذ کی قبا تُو نے

سبق لیتا رہا افتادگی کا خاکِ ساحل سے

نہ سیکھا موجِ دریا سے علاجِ خوابِ پا تُو نے

نہیں ہے دہریت کیا بندۂ حرص و ہوا ہونا

قیامت ہے مگر اوروں کو سمجھا دہریا تُو نے

وہ حسنِ عالم آرا تیرے دل میں جلوہ گستر تھا

غضب ہے آسمانوں میں دیا اس کا پتا تُو نے

نہیں ممکن شناسائی ہو تجھ کو رمزِ وحدت سے

صدائے غیر سمجھا جب سُنی اپنی صدا تُو نے

(۷)

نظر اس دور میں مجھ کو نرا جینا نہیں آتا
کہ صہبائے محبّت کا تجھے پینا نہیں آتا

پکڑ کر عجز کا دامن پہنچ عرشِ معلّےٰ پر
نگاہوں کو نظر اس بام کا زینا نہیں آتا

عدو صبح صفائے دل کی ہے ظلمت تعصّب کی
مقابل چشمِ نابینا کے آئینا نہیں آتا

یہیں بے نور ہے، محشر میں تو کیا خاک دیکھے گا
کہ تجھ کو دیکھنا اے دیدۂ بینا نہیں آتا

یہ بہتر تھا کہ تو اے شیشۂ دل چُور ہو جاتا
صفا رہنا تجھے مانندِ آئینا نہیں آتا

اکارت ہے بناوٹ سے ترا رونا نمازوں میں

کہ ہاتھ اس طرح وہ پوشیدہ گنجینا نہیں آتا

بنا آنکھوں کو جامِ اشک، دل کو درد کا مینا

مزا جینے کا کچھ بے ساغر و مینا نہیں آتا

بُجھا دینا ہی اچھا ہے چراغِ زندگانی کا

محبّت میں جو مر کے تجھے جینا نہیں آتا

بنا اس راہ میں ذوقِ طلب کو ہم سفر اپنا

اکیلے لطفِ سیرِ وادیٔ سینا نہیں آتا

تلاشِ خضر کب تک تشنۂ زہرِ محبّت ہو

جسے مرنا نہیں آتا اُسے جینا نہیں آتا

نمی گویم قیامت جوش زن یا شورِ طوفاں شو

ز طوفاں دستبردار آنچہ نتوانی شدن آں شو

(۸)

تبسّم سے غرض ہے پردہ داری چشمِ گریاں کی

چُھپا کر بیٹھ صُبحِ عید میں شامِ محرّم کو

جمالِ یُوسفِ یثرب کو دیکھ آئینہ دل میں

نہ ڈھونڈ اے دیدۂ حیراں نمودِ ابنِ مریم کو

شفا دیکھی ہے بیماروں میں کیا ان دردمندوں نے

کہ بے حاصل سمجھتے ہیں تلاشِ ابنِ مریم کو

خدا جانے یہ بندے کون سی آتش میں جلتے ہیں

کہ خاکستر کی اک مُٹّھی سمجھتے ہیں جہنّم کو

(مخزن مارچ سنہ ۱۹۰۴ء)

نالۂ فراق

ابتدا میں اس نظم کے آٹھ بند تھے ۔ نظرِ ثانی کے وقت یہ بند
حذف کیئے گئے ۔

ہو گئی رخصت مسرّت، غم مرا ہمدم ہوا
دفترِ صبر و شکیبائی جو تھا برہم ہوا
کچھ عجب اس کی جدائی میں مرا عالم ہوا
دل مرا منّت پذیرِ نالۂ پیہم ہوا
حاضراں از دور چوں محشر خروشم دیدہ اند
دیدہ ہا باز است لیک از راہ گوشم دیدہ اند

دجلہ ریزی کر رہا ہے دیدۂ پُرخوں مرا
صورتِ سیماب مضطر ہے دلِ محزوں مرا

دردِ فرقت سے ہے رنگیں نالۂ موزوں مرا

داغِ حرماں ہے سراپا ہر گُلِ مضموں مرا

آہ وہ حاصل نہیں اوروں کی مدحت میں مجھے

لطف جو ملتا تھا کچھ تیری ملامت میں مجھے

زندگی کا دامنِ انساں میں گویا خار ہے

آرزو کا دِل میں، سینے میں نفس کا خار ہے

یُوں تو اس عالم کے ہر ذرّے سے اُگتا خار ہے

خارِ فرقت کا مگر سب سے نکیلا خار ہے

"زندگانی در جگر خار است و در پا سوزن است

تا نفس باقی است در پیراہنِ ما سوزن است"

(مخزن مئی ۱۹۰۴ء)

چاند

نظرِ ثانی میں اس نظم کے مندرجہ ذیل شعر مختلف جگہوں سے قلم زد کیے گئے۔

اے قمر کیا خامشی افزا ہے تیری روشنی
رات کے دامن میں گویا ہے سحر سوئی ہوئی

حسن کامل تیری صورت کا نشاط انگیز ہے
چاندنی میں تیری اک تسکینِ غم آمیز ہے

گھر بنایا تو نے گو ہنگامۂ ہستی سے دور
چاندنی تیری نہیں انسان کی بستی سے دور
ہاں اُتر آ دل میں میرے ساتھ لیکر چاندنی
اس اندھیرے گھر میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

(مخزن جولائی سنہ ۱۹۰۴ء)

بلالؓ

اس نظم سے مندرجہ ذیل شعر حذف کیے گئے :-

ستم ہے شوق کی آتش کو مثلِ موجِ ہوا
"خدا بھلا کرے آزار دینے والوں کا"

ترے نصیب کا آخر چمک گیا اختر
علیؓ کے سینے میں جو راز تھا کھلا تجھ پر

نمازِ عشقِ حسینؓ حجاز ہے گویا
یہی نماز خدا کی نماز ہے گویا

مخزن ستمبر ۱۹۰۴ء

سرگزشتِ آدم

اس نظم کے بہت سے اشعار نظرِ ثانی میں حذف کیے گئے جو یہ ہیں :-

نگاہ پائی ازل سے جو نکتہ بیں مَیں نے
ہر ایک چیز میں دیکھا اسے مکیں مَیں نے

سوالِ دید میں لذّت ہے اے کلیم ایسی
ہزار بار سُنی ہے وہی 'نہیں' مَیں نے

کہا کسی نے فسانہ جو عرش و کُرسی کا
وُہ سادہ لوح ہُوں مَیں کر لیا یقیں مَیں نے

کبھی میں قتل ہُوا کربلا کے میداں میں
کبھی کسی کو سِتم پر بھی آفریں مَیں نے

اُٹھائے تلخیٔ انکار کے مزے کیا کیا

بنا کے ایک زمانے کو نکتہ چیں مَیں نے

عجیب طرز ہے کچھ گفتگوئے واعظ کا

خدا بچائے یہ باتیں سُنی نہ تھیں مَیں نے

وہ چیز نام ہے جس کا جہاں میں آزادی

سُنی ضرور ہے دیکھی کہیں نہیں مَیں نے

نہ توڑ میرے دلِ دردمند کو ظالم

بڑی تلاش سے پایا ہے یہ نگیں مَیں نے

خُدا تو مِلتا ہے انسان ہی نہیں مِلتا

یہ چیز وُہ ہے کہ دیکھی کہیں نہیں مَیں نے

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیر اقبالؔ

مَیں بُت پرست ہوُں رکھدی کہیں جبیں مَیں نے

(مخزن ستمبر سنہ ۱۹۰۴ء)

صُبح کا ستارا

پہلے بند کا دوسرا اور دُوسرے بند کا آٹھواں شعر جو
بانگِ درا میں شامل نہیں۔

عارضی حُسن ہے دشمن میں مرا نورِ سحر
یہ ہلا خسروِ خاور کا پیامی بن کر

صبر کا خون نکل آیا ہو ہل کر مجُھ میں
ایک طُوفان ہو افکار کا مضمر مجُھ میں

(مخزن - فروری ۱۹۰۲ء)

ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت

اس نظم کا آخری بند یہ تھا :-

گوتم کا جو وطن ہے ، جاپان کا حرم ہے
عیسےٰ کے عاشقوں کا چھوٹا یروشلم ہے
مدفون جس زمیں میں اسلام کا حشم ہے
ہر پھول جس زمیں کا فردوس ہے ارم ہے
میرا وطن وہی ہے ۔ میرا وطن وہی ہے

(مخزن فروری سنہ ۱۹۰۵ء)

نیا شوالہ

یہ نظم کافی طویل تھی۔ اس کے پہلے بند سے ایک شعر اور دوسرے
سے مندرجہ ذیل نو شعر حذف کیئے گئے :۔

کچھ فکر پھوٹ کی کر مالی ہے تُو چمن کا
بُوٹوں کو پھونک ڈالا اس بِس بھری ہوا نے

پھر اک انوپ ایسی سونے کی مُورتی ہو
اس ہردوار دِل میں لا کر اسے بٹھا دیں

سندر ہو اس کی صورت، چھب اسکی موہنی ہو
اس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہوں مُرادیں

زنّار ہو گلے میں، تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنی صنمکدے میں شانِ حرم دکھا دیں

پہلو کو چیر ڈالیں درشن ہو عام اُس کا
ہر آتما کو گویا اِک آگ سی لگا دیں

آنکھوں کی ہے جو گنگا لے لیکے اس سے پانی
اس دیوتا کے آگے اک نہر سی بہا دیں

"ہندوستاں" لکھ دیں ماتھے پہ اس صنم کے
بھُولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سُنا دیں

مندر میں ہو بُلانا جس دم پُجاریوں کو
آوازۂ اذاں کو ناقوس میں مِلا دیں

اگنی ہے جو وُہ نرگن، کہتے ہیں پیت اس کو
دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ میں جلا دیں

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا
رونا، ستم اُٹھانا اور ان کو پیار کرنا

(مخزن مارچ ۱۹۰۵ء)

داغ

یہ نظم مخزن کے "یادگارِ داغ نمبر" میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے چار بند تھے۔ نظرِ ثانی کے وقت آخری بند کو دو حصوں میں تقسیم کر کے پانچ بند بنا دئے گئے۔ باقی نظم میں بھی کافی ترمیم و تنسیخ ہوئی۔ جو شعر حذف کئے گئے وہ یہ ہیں :-

جوہرِ رنگیں نوائی پا چکا جس دم کمال پھر نہ ہو سکتی تھی ممکن میر و مرزا کی مثال
کر دیا قدرت نے پیدا ایک دونوں کا نظیر داغ یعنی وصلِ فکرِ میرزا و دردِ میر
شعر کا کاشانہ لیکن آج پھر ویراں ہوا دیدۂ خونبار پھر منت کشِ درماں ہوا

کم نہیں محشر سے کچھ ایسی صدا کی خامشی
آہ! دلسوزی تو تھی گو نکتہ آموزی نہ تھی

(مخزن اپریل ۱۹۰۵ء)

کنارِ راوی

اِس نظم کے دوسرے بند سے یہ دو شعر حذف کیے گئے :-

نظارہ موج کو پھر وجہِ اضطراب ہے کیا
یہ کہنہ مشق نو آموز پیچ و تاب ہے کیا

نمازِ شام کی خاطر یہ اہلِ دِل ہیں کھڑے
مری نگاہ میں انسان پا بہ گل ہیں کھڑے

(مخزن نومبر ۱۹۰۵ء)

التجائے مُسافر

(بہ درگاہ حضرت محبُوبِ الٰہی دہلی)

یہ نظم بانگِ درا میں موجود ہے۔ محذوفہ اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ نیز نظم کے شانِ نزول میں مولانا غلام بھیک نیرنگ کے رشحاتِ قلم بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ ہم اشعار کے ساتھ سید صاحب موصوف کی عبارت بھی نقل کیے دیتے ہیں کہ لطف دوبالا ہوجائے۔

"۲ ستمبر ۱۹۰۵ء ہمارے خاص احباب کی تاریخِ محبت میں ایک قابلِ یادگار دن ہے۔ صُبح کا سہانا سماں ہے۔ بمبئی میل دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچی ہے خواجہ سید حسن نظامی دہلوی اور منشی نذر محمد بی۔ اے۔ اسٹیشن پر استقبال کو آئے ہیں استقبال کس کا ہے؟ جدید شاعری کے رُوحِ رواں اقبالؔ بااقبال اور اسکے ہمراہیوں کا۔ وُہ کیسے؟ اقبال بغرض تعلیم علوم و فنون انگلستان کو روانہ ہوئے ہیں۔ نیرنگؔ اور

اکرآم اپنے پیارے دوست کو رخصت کرنے کیلئے دہلی تک ساتھ گئے ہیں۔ ریل سے
اُتر کر اوّل منشی نذر محمد صاحب کے مکان پر تھوڑی دیر آرام کیا۔ بعد میں سب دوست
مل کر حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء قدس سرّہٗ کی درگاہ آسماں پائگاہ کی طرف
روانہ ہوئے۔ راستہ میں شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے کی زیارت اور سَیر کی۔ درگاہ میں پہنچ کر
مزارِ مبارک پر حاضر ہوئے۔ اوّل اقبالؔ نے عالمِ تنہائی میں مزارِ مبارک کے سرہانے بیٹھکر
ذیل کی نظم پڑھی اور ان کی درخواست پر سب احباب باہر صحن میں ٹھہرے رہے۔ بعد میں
دوستوں کے اصرار پر اقبالؔ نے اس نظم کو درگاہ کے صحن میں بیٹھکر مزارِ مبارک کی طرف
مُنہ کر کے دوبارہ ایک نہایت درد انگیز اور دلنشیں لہجہ میں پڑھا۔ سب احباب اور دیگر
سامعین نہایت متاثّر ہوئے۔ اور بے تحاشا زبان سے موقع بموقع کلماتِ تحسین و آفرین
نکلتے تھے۔ ایک محویّت کا عالم تھا کہ جس کی تصویر حاضرین کے تصوّر ہی کھینچ سکتے ہیں۔
درگاہ سے واپس ہو کر خواجہ حسن نظامی صاحب کے مکان پر قیام کیا۔ ولایت نامی ایک نوعُمر
قوال خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ نو تعلیم تھا مگر خوش گلو اور باطبیعت۔ وُہ

کچھ گاتا رہا اور وقت نہایت مزے اور کیفیت سے گزرا۔ اور اس کے بعد شہر کو واپس ہوئے۔ واپسی پر خاتم الشعراء مرزا اسد اللہ خاں غالب کی تربت پر حاضر ہوئے۔ بندہ نیرنگ۔ مرزا صاحب کی تربت کے سرہانے لوحِ تربت پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھا تھا۔ میرے دائیں جانب اقبال عالم محویت میں بیٹھے تھے اور تربت کے گرد اگرد تمام پارٹی حلقہ باندھے ہوئے تھی۔ دو بجے دن کا وقت اور دن بھی ستمبر کا۔ دھوپ تیز اور ہوا میں گھمس۔ مگر اسی قبر کی زیارت کا اثر تھا کہ کسی کو گرمی کا خیال تک نہ تھا۔ قوال زادے کو عجیب وقت کی سوجھی۔ بولا حضور! مرزا غالب کی ایک غزل یاد آئی اگر اجازت ہو تو سناؤں۔ سرود بمستاں یاد دہانیدن۔ یہاں کس کو عذر تھا۔ چنانچہ اس نے یہ غزل گائی ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی

دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

ذیل کے دو شعروں پر عجیب کیفیت رہی ؎

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں | بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں | اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

غزل کے ختم ہونے پر جب ایک دو منٹ میں ذرا ہوش بجا ہوئے تو سب چلنے کو اُٹھے۔ اقبالؔ نے جوشِ محویت میں مرزا صاحب کے مزار کو بوسہ دیا۔ اور سب شہر کو روانہ ہوئے۔ اچھا اقبالؔ

بہ سفر رفتنت مبارک باد | بسلامت روی و باز آئی

زندہ رہیں گے تو تین سال بعد تیرے کلام کو تیری زبان سے پھر سُنیں گے۔"

ترے وجود سے روشن ہے راہِ منزلِ عشق | دیارِ عشق کا مصحف کلام ہے تیرا
خروشِ میکدۂ شوق ہے ترے دم سے | طلب ہو خضر کو جس کی وہ جام ہے تیرا
کرم کرم کہ غریب الدیار ہے اقبالؔ | مریدِ پیرِ نجف ہے غلام ہے تیرا

کیا ہے تیرا مقدّر نے مدح خواں مجھکو | کھے ہزار مُبارک مری زباں مجھ کو
چڑھا کے پھول مرے رنگِ رفتہ کے سرِ قبر | اُڑائے پھرتی ہے حیرت کہاں کہاں مجھکو

بیاں کروں تپشِ عشق کو تو آتشِ دِل	شرارے دے پے تمہیدِ داستاں مجھکو
مَیں نفتہ دِل ہُوں پُرانا نیاز مند ترا	دِکھایا آج خدا نے یہ آستاں مُجھ کو
مرے سفینے کو تُو نے کنارہ بوس کیا	اماں نہ دیتا تھا جب بحرِ بیکراں مجھکو
تلاشِ مہر میں شبنم صفت اُڑا کے چمن	ذرا سا دیتا ہے غنچہ کا آشیاں مجھ کو
رہوں میں خادمِ خلقِ خُدا جیوُں جب تک	نہیں ہے آرزوئے عُمرِ جاوداں مُجھ کو
گریز میرے دلِ دردمند کا ہے شعار	بہُت ستاتا ہے اندیشۂ زیاں مُجھ کو
بنایا تھا جسے چُن چُن کے خاروخس میں نے	چمن میں پھر نظر آئے وُہ آشیاں مجھ کو
مراد یار بھی معشوق بھی برادر بھی	کہ جس کے عشق سے جنت ہے یہ جہاں مجھکو
یونہی بنی رہے محفل مرے احبّا کی	ہرا بھرا نظر آئے یہ بوستاں مُجھ کو
بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا	ملا ہے جس کی بدولت یہ آستاں مُجھکو
قسم ہے اسکے دلِ دردمند کی آقا	تری ثنا کیلئے حق نے دی زباں مجھ کو

(مخزن۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء)

عاشقِ ہرجائی

اس نظم میں مندرجہ ذیل چار شعر شامل نہیں:-

ناؤ طوفانی ہے لیکن صورتِ گوشِ صدف

گوش تیرا موج کی شورش سے بے پروا بھی ہے

ہم عنانِ عصرِ حاضر عاشقِ عہدِ کہن

دوش ہی گویا تجھے امروز بھی فردا بھی ہے

تو پریشاں مو مثالِ قیس رہتا ہے مگر

اس پریشانی میں سیرِ گیسوئے لیلےٰ بھی ہے

(۲)

تو ذرا میری نظر کی جلوہ آشامی تو دیکھ

طُور شرما جائے ایسا حوصلہ رکھتا ہُوں مَیں

کوششِ ناتمام

ابتدا میں اس نظم کا عنوان "...... کے نام" تھا۔ اور اس کے دو بند تھے۔ بانگِ درا میں اس کا صرف ایک بند شامل کیا گیا۔ اور اس سے بھی یہ دو شعر حذف کر دئے گئے :۔

آئی صدا یہ چاند کی بزمِ طواف پیشہ سے
صُبحِ ازل سے ہے سفر رہتا قیام کے لئے
قلب حزیں سے مانگ کے لائی ہے داغِ جُستجو
بادِ بہار لالہ شعلہ بجام کے لئے

تنہائی

ابتدا میں اس نظم کے سات شعر تھے - پانچ بانگ درا میں آ چکے ہیں - باقی دو یہ ہیں :-

آوارہ یہ چاند، رات خاموش
صہبائے نظّارہ وے گوش

یہ بُوئے گلِ قمر، یہ مہتاب
خم خانۂ دہر کی مۓ ناب

جلوۂ حُسن

بانگ درا کی اس نظم میں دو شعر یہ بھی تھے :-

یعنی جو آگ تاثر کو لگا دیتا ہے
اور دل کو شرر آباد بنا دیتا ہے

دورۂ عصر کی ہستی کو مٹاتا ہے خیال
ہر گھڑی ایک نیا دہر بناتا ہے خیال

عبدالقادر کے نام

اس نظم سے مندرجہ ذیل شعر نظرِ ثانی کے وقت حذف کیے گئے :۔

پھونک ڈالا تھا کبھی دفترِ باطل جس نے
حدّتِ دم سے اسی شعلے کو پیدا کردیں

تنِ آتش زدۂ شوق کو مانندِ سرشک
قطعِ منزل کے لئے آبلۂ پا کر دیں

درد ہے سارے زمانے کا ہمارے دِل میں
جنس کمیاب ہے آ نرخ کو بالا کر دیں

زاہدِ شہر کہ ہے سوختہ طبعی میں مثال
خشک ہے اس کو غریقِ نمِ صہبا کردیں

سنگ رس شاخ چُنی ہم نے نشیمن کے لئے
اپنے بے دردوں کو آمادۂ ایذا کردیں

صقلیہ

(جزیرۂ سسلی)

اس نظم کے پہلے بند کے شعر نمبر ۲، ۳، ۴ اور پانچ ابتدا میں یوں تھے :-

یہ محل خیمہ تھا ان صحرا نشینوں کا کبھی | بحر بازی گاہ تھا اُنکے سفینوں کا کبھی
آفرینش جن کی دُنیائے کہن کی تھی اجل | جن کی ہیبت سے لرز جاتے تھے بابل کے محل
زندگی دُنیا کو جن کی شورشِ قُم سے ملی | مخلصی انساں کو زنجیرِ توہّم سے ملی

جس کے آوازے سے لذّت گیر اب تک گوش ہے
وُہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

تیسرے بند کا آخری شعر یوں تھا ؎

مرثیہ تیری تباہی کا مری قسمت میں تھا
یہ تڑپنا اور تڑپانا مری قسمت میں تھا

(مخزن اگست ۱۹۰۸ء)

بلادِ اسلامیہ

مخزن میں شائع ہونے کے بعد بانگِ درا کی ترتیب کے وقت اس کے مندرجہ ذیل شعر حذف کیئے گئے اور بعض شعروں میں جزوی ترمیم ہوئی۔ پہلا بند۔ تیسرا شعر:-

دورِ گردوں میں نمونے سینکڑوں تہذیب کے
پل کے نکلے مادرِ ایّام کی آغوش سے

پانچواں بند۔ چوتھا، پانچواں اور چھٹا شعر:-

خشک لبِ انساں کو جس نے آبِ جاں پرور دیا — عقل کو آزادِ زنجیرِ توہّم کر دیا
جس نے عہدِ وصل باندھا مدّتِ دوراں کیساتھ — جس نے پوری منصفی کی فطرتِ انساں کیساتھ
جھکے ڈر سے وہم کا قصرِ کہن آئیں گرا — گردنِ انساں سے طوقِ راہبِ خود بیں گرا

چھٹا بند جو پورا حذف کیا گیا:-

گو مٹانا بستیوں کا ہے شعارِ روزگار
عظمتِ ملّت کی باقی یادگاریں ہیں ہزار

یہ ہویدا ہے کہیں مٹتے ہوئے آثار میں
یا نمایاں ہے کسی گرتی ہوئی دیوار میں

اُجڑے گورستاں کی خاموشی سے ہم آغوش ہے
شانِ پیشیں اشک خونِ قوم سے گل پوش ہے

نالہ کرتی ہیں کہیں خاموش سوتی ہے کہیں
اہلِ ملّت کی فراموشی کو روتی ہے کہیں

جلوہ گاہیں اس کی ہیں اپنی زیارت کے لئے
اشکباری کے لئے غم کی حکایت کے لئے

(مخزن - اپریل سنہ ۱۹۰۹ء)

گورستانِ شاہی

یہ نظم ان شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت سے متأثر ہو کر لکھی تھی جن میں سلاطین قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں میں سے چھن چھن کر آتی ہوئی چاندنی نے اس پُر حسرت منظر کے ساتھ مل کر اقبال کے دل پر ناقابلِ فراموش اثر کیا۔

اس نظم کے اکثر اشعار میں ردّ و بدل کیا گیا اور کئی کاٹ دئے گئے جو یہ ہیں۔ چوتھا بند چوتھا شعر ؎

کہہ رہی ہے کوئی ایامِ کہن کی داستاں
چاندنی کرتی ہے میناروں سے کیا سرگوشیاں

گیارھواں بند۔ پہلا دوسرا پانچواں چھٹا شعر ؎

صبح کے تارے پہ تھی مشرق کے رہزن کی نظر
وہ اُڑا کر لے گیا آویزۂ گوشِ سحر

شب کے اختر دیدۂ خورشید سے ڈرتے ہیں یہ
بھیس شبنم کا بدل کر سیرِ گل کرتے ہیں یہ

رات یہ تاروں بھری ذوقِ نظر کی عید ہے
ریزہ ریزہ ٹوٹ کر پیمانۂ خورشید ہے

اُگتے ہیں شاخِ چمن سے شعلۂ بے سوزِ گل
رُوح کا فردوس ہے حُسنِ نظر افروزِ گل

بارھواں بند چھٹا شعر ؎

خندۂ طفلک سے ہے اسکی چمک محبُوب تر
چھو نہیں سکتی اسے صرصر کی موجِ پُر خطر

(مخزن جون ۱۹۰۱ء)

پھول کا تحفہ عطا ہونے پر

اس نظم کے بارہ شعروں میں سے آٹھ بانگ درا میں آچکے ہیں
باقی چار حسب ذیل ہیں ؎

ہجومِ گل میں پسندِ نگاہِ ناز ہوا
ترانہ ریز تری زندگی کا ساز ہوا

کسی کے حسنِ دلاویز پہ نثار ہے تو
خموش نغمۂ تارِ رگِ بہار ہے تو

یہ میرے ہاتھ میں خونیں نوائیاں کیسی
مجھے خبر ہے کہ جدائی میں بقرار ہے تو

فسردگی کا تجھے میرے گھر میں کیا غم ہے
صبا ہے آہوں کی اور آنسوؤں کی شبنم ہے

بزمِ انجم

"بانگِ درا میں اس عنوان کے تحت تین بند کی ایک نظم شائع ہوئی ہے۔

پہلے اس نظم کا عنوان "تاروں کا گیت" تھا۔ دو بند کے بعد باقی اشعار غزل کے عنوان سے تھے۔ جس میں سے بہت سے اشعار ترک کر دئے گئے اور باقی اشعار تیسرے بند کی صورت میں شائع ہوئے۔ پہلے بند سے بھی ایک شعر حذف کیا گیا۔ حسبِ ذیل اشعار کسی مجموعے کی زینت نہیں بنے۔" (روزگار فقیر حصہ دوم ص۲۳۶)

(۱)

ہے خواب کی پیامی چشمِ کشودہ جن کی
وہ نیلے آسماں کے اُڑتے ہوئے شرارے

(۲)

چھ اشعار کا یہ بند پہلے غزل کی صورت میں شائع ہوا تھا۔

یہ رسم ہے پُرانی رہتے ہیں درد والے

بے خواب مثلِ انجم راتوں کی خامشی میں

سمجھیں گے کیا وہ ناداں آئینِ سروری کو

ناقص ہیں اب تلک جو آدابِ بندگی میں

مِلّت حجاز کی ہے مصروفِ فرقہ بندی

نادان لُٹ رہے ہیں سُورج کی روشنی میں

بالائے ریگِ صحرا خوابیدہ رہ گئے یہ

رخصت ہوئے مسافر تاروں کی روشنی میں

بنتی بگڑتی دیکھیں ہم نے ہزاروں قومیں

اِک بات ہے نرالی اِس بزمِ آخری میں

بارِ گلوئے مِلّت طوقِ وطن نہیں ہے

تازے ہیں یہ مُسافر اسلوبِ راہروی میں

سیرِ فلک

اس نظم کے دُوسرے بند کا پانچواں شعر یہ تھا۔ جو بانگ درا
میں شامل نہ کیا گیا ؎

ظلمت افزا تھا اس قدر وُہ مقام
چاند چمکے وہاں تو ہو بے ہوش

فلسفۂ غم

جولائی ۱۹۱۰ء کے مخزن میں جب یہ نظم پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی تو اس کے
ساتھ اقبال کی مندرجہ ذیل تحریر بھی تھی۔ جسے ان کی یادگار سمجھ کر یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"ذیل کے اشعار میں نے اپنے دوست اور ہم جماعت میاں فضل حسین صاحب

بیرسٹرایٹ لا، لاہور کی خدمت میں انکے والدِ بزرگوار کی ناگہانی

رحلت کے موقعہ پر بطورِ تسلّی نامہ کے لکھے تھے۔ اگرچہ میری تحریر

پرائیویٹ تھی۔ اور اس کی اشاعت کچھ ضرور نہ تھی۔ تاہم میں چاہتا

ہُوں کہ یہ اشعار میاں صاحب موصوف کے احبّاء اور معترفین تک

بھی پہنچیں جنھوں نے اس موقع پر میاں صاحب موصوف کے ساتھ

اظہارِ ہمدردی کیا ہے۔" (اقبالؔ)

نظرِ ثانی میں تیسرے بند کے چوتھے شعر کو بدل دیا گیا جو پہلے یُوں تھا ؎

گو بظاہر تلخیٔ دوراں سے آرامیدہ ہے

زندگی کا راز اس کی آنکھ سے پوشیدہ ہے

نصیحت

یہ نظم ابتدا میں اس مصرع سے شروع ہوتی تھی ؏

کل ملا مجھ سے جو اقبال تو پوچھا میں نے

اس کا چوتھا اور آخر کے تین شعر حذف کیے گئے جو یہ تھے ؎

کبھی ایراں کیلئے ہو جو دُعا کا جلسہ　　عذر تیرا ہے کہ ہے میری طبیعت ناساز

سُن کے کہنے لگا اقبال بجا فرمایا　　شک مجھے آپکی باتوں میں نہیں بندہ نواز

مُجھ میں اوصاف ضروری تو ہیں موجود مگر　　ہے کمی ایک کہوں تجھ سے جو ہو فاش نہ راز

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی

اور پنجاب میں ملتا کوئی اُستاد نہیں

(مخزن مئی ۱۹۱۱ء)

غرّۂ شوّال

اس کے پہلے بند سے مندرجہ ذیل شعر قلم زد کیا گیا ؎

وسعتِ ہستی میں گو رفعت تجھے منظور ہے
اے فلک مسکن! اُفق گردی ترا دستور ہے

دوسرے بند سے یہ شعر کاٹے گئے ؎

رہ گئے اپنی کہن دامی سے ہم محرومِ صید
اس چمن میں اپنی قسمت کی نگوں ساری بھی دیکھ
مکر کے پھندے میں شہبازِ مراکش آ گیا
امّتِ عیسیٰ کا آئینِ جہاں داری بھی دیکھ

(مخزن اکتوبر ۱۹۱۱ء)

شمع اور شاعر

یہ نظم اقبال نے فروری ۱۹۱۲ء میں کہی - اور ۱۶ر اپریل ۱۹۱۲ء کو
انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں پڑھکر سنائی۔ نظرِ ثانی
کے وقت ساتویں بند کا یہ شعر چھوڑ دیا ؎

ملک ہاتھوں سے گیا ملّت کی آنکھیں کھُل گئیں
سرمہ چشمِ دشت میں گردِ رمِ آہو ہُوا

حضورِ رسالتمآبؐ میں

یہ نظم ۶؍ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو شاہی مسجد لاہور میں مسلمانوں کے مجمعِ عام کے سامنے پڑھی گئی۔ ۱۰؍ اکتوبر ۱۹۱۱ء کے روزنامہ زمیندار اکتوبر ۱۹۱۱ء کے مخزن اور نومبر ۱۹۱۱ء کے کشمیری میگزین میں شائع ہوئی۔ نظرِ ثانی میں پہلے بند کا تیسرا شعر کاٹ دیا گیا۔ جو یہ تھا:

ہوا رفیقِ اجل اشتیاقِ آزادی
سمندِ عمر کو اک اَور تازیانہ ہوا

یہ نظم ۱۹۱۴ء میں جنگِ بلقان کے دوران موچی دروازہ کے باغ میں ایک عام جلسہ میں سُنائی گئی۔ اس کے بعد جو بند نظرِ ثانی میں حذف کئے گئے، یہ ہیں ؎

جب مِے درد سے ہو خلقتِ شاعر مدہوش
آنکھ جب خون کے اشکوں سے بنے لالہ فروش
کشورِ دِل میں ہوں خاموش خیالوں کے خروش
چرخ سے سُوئے زمیں شعر کو لاتا ہے سروش
قیدِ دستور سے بالا ہے مگر دِل میرا
فرش سے شعر ہوا عرش پہ نازل میرا

جس طرح احمدِ مختار ہے نبیوں میں امام

اس کی اُمّت بھی ہے دُنیا میں امامِ اقوام

کیا تمھارا بھی نبی ہے وُہی آقائے انام

تم مسلماں ہو؟ تمھارا بھی وُہی ہے اسلام

اس کی امّت کی علامت تو کوئی تم میں نہیں

مے جو اسلام کی ہوتی ہے وُہ اِس خُم میں نہیں

وسعتِ کون و مکاں ساز ہے مضراب ہے یہ

دہر مسجد ہے سراپا، خمِ محراب ہے یہ

جامِ گردوں میں عیاں مثلِ مئے ناب ہے یہ

رُوحِ خورشید ہے خونِ رگِ مہتاب ہے یہ

صوت ہے نغمۂ کُن ہیں تو اسی نام سے ہے

زندگی زندہ اسی نور کے اتمام سے ہے

انجم اس کے فلک اس کے ہیں زمیں اس کی ہے

کیا یہ اغیار کی دُنیا ہے؟ نہیں اس کی ہے

سجدے مسجود ہوں جس کے وُہ جبیں اس کی ہے

وُہ ہمارا ہے امیں، قوم امیں اس کی ہے

طوف احمدؐ کے امینوں کا فلک کرتے ہیں

یہ وہ بندے ہیں ادب جن کا ملک کرتے ہیں

عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں

یہ نظم مولوی نظام الدین حسین نظامی مالک نظامی پریس وایڈیٹر ذوالقرنین بدایوں کی فرمائش پر کہی گئی تھی۔ اور ذوالقرنین کی ۲۱ راگست ۱۹۱۵ء کی اشاعت میں بہت اہتمام کیساتھ شائع ہوئی تھی۔ اس کے آٹھ شعر تھے بانگ درا کی ترتیب کے وقت چوتھا اور ساتواں شعر حذف کر دیا گیا۔

جو یہ ہیں ؎

مجھے قسم ہے نظامی مدینے والے کی
ہمیشہ ماتمِ ملت میں اشکبار ہوں میں
سرودِ مرغِ نوا ریز دہم نشینیٔ گل
مرے نصیب کہاں غنچۂ مزار ہوں میں

محاصرۂ ادرنہ

اس نظم کا پہلا نام "اسلامی رواداری" تھا۔ اور اس میں سے مندرجہ ذیل اشعار نظرِ ثانی کے وقت حذف کیے گئے ؎

تھا امتیاز کچھ نہ ہلال و صلیب میں
مقصود فوج خانۂ معمور ہو گیا

اقبالؔ اس پیمبرِ اُمّی کے ہیں فدا
ایثار جس کی قوم کا دستور ہو گیا

دنیا میں جس کی مشعلِ خُلقِ عظیم سے
ہر ذرّہ شرحِ سُورۂ والنّور ہو گیا

اُمّت کا جس نبیؐ کی حروفِ جلی ہیں نام
قرطاسِ روزگار پہ مسطور ہو گیا

مرہونِ پیچ و تاب وہ اُمّت ہے اب تو کیا
کیا غم جو اس کا دن شبِ دیجور ہو گیا

دنیا میں پیچ و تاب ہے شرطِ ثمر کہ تاک
کھا کھا کے پیچ صاحبِ انگور ہو گیا

فاطمہ بنتِ عبداللہ

اِس نظم کے دو شعروں میں قدرے ترمیم کی گئی اور یہ چار شعر حذف کیے گئے:۔

ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

دل کہ برگِ نازکِ گُل سے بھی تھا پاکیزہ تر

سینۂ مِلّت میں ایسا جلوۂ نادیدہ تھا

جس کے نظّارے میں اک عالم سراپا دیدہ تھا

یعنی نوزائیدہ تاروں کا فضا میں ہے ظہُور

دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نُور

ہے ابھی جن کے لیے رفتار کی لذّت نئی

آسماں کا خم نیا، وسعت نئی، عظمت نئی

والدہ مرحومہ کی یاد میں

اس نظم کے مندرجہ ذیل شعر نظرِ ثانی میں حذف کیے گئے :۔

اپنی نادانی میں انساں کس قدر آسُودہ ہے

تہمتِ تاثیر سے موجِ نفس آلُودہ ہے

زندگی کی رہ میں جب مَیں طفلِ نو رفتار تھا

جادۂ خوابیدہ ہر ہر گام پر دُشوار تھا

قطع تیری ہمّت افزائی سے یہ منزل ہوئی

میری کشتی بوسہ گُستاخِ لبِ ساحل ہوئی

وہ قوی[1] فطرت کہ ہے جس کی طبیعت استوار

جس کے دل سے کانپتے ہیں حادثاتِ روزگار

---

[1] برادرِ بزرگوار۔

ہم سمجھتے ہیں ثبات زندگی پیکر سے ہے

پیکروں کی بے ثباتی جورِ پیکر گر سے ہے

خام فکری سے شفق خونِ سحر سمجھی گئی

صبح شبنم سے بیاضِ چشمِ تر سمجھی گئی

دیکھنے میں گرچہ ہے مثلِ شرر ان کا فروغ

خندہ زن ہے صرصرِ ایّام پہ ان کا فروغ

کیسی حجّت خیز ہے ظلمت فروشی رات کی

دن کے ہنگاموں کا ہے مدفن خموشی رات کی

ظلمتِ آشفتہ کا کل وسعتِ عالم میں ہے

اشکِ انجم در گریباں روز کے ماتم میں ہے

طفلک شش روزۂ کون و مکاں خاموش ہے

رات کے آغوش میں لپٹا ہؤا بے ہوش ہے

آبِ دریا خفتہ ہے موجِ ہوا غش کردہ ہے
پست ہر ہستی کے سازِ زندگی کا پردہ ہے

شعاعِ آفتاب

یہ نظم سر مائیکل اوڈوائر گورنر پنجاب کی فرمائش پر ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۸ء کو ایک سرکاری مشاعرے میں پڑھی گئی جو پہلی جنگِ یورپ میں اتحادیوں کی فتح کے موقعہ پر منعقد ہُوا۔ یکم فروری ۱۹۱۹ء کے "حق" اخبار میں شائع ہوئی۔ نظرِ ثانی میں ساتویں شعر کا ایک مصرع بدلا گیا اور مندرجہ ذیل آخری شعر حذف کر کے نیا شعر لکھا گیا ؎

کند تلواریں ہوئیں عہدِ زرہ پوشی گیا
جاگ اُٹھ تو بھی کہ دورِ خود فراموشی گیا

نانک

اِس نظم کے گیارہ اشعار میں سے آخری تین شعر بانگ درا میں شامل نہیں :-

تیرے پیمانے میں اے ساقی شرابِ ناب تھی
تیری شخصیّت نے کھینچا ہر دل آگاہ کو

اپنے میدانوں میں جب رزمِ ممالک عام تھی
زندگی تیری سراپا صُلح کا پیغام تھی

ہند کے بُت خانے میں کعبے کا تُو معمار تھا
کتنا باطل سوز تیرا شعلۂ گفتار تھا

مذہب

تین اشعار کی یہ نظم بانگِ درا میں موجود ہے - ابتدا میں یہ صائبؔ کے ایک شعر کی تضمین تھی - حذف کئے ہوئے شعر یہ ہیں ؎

کانپتا ہُوں پڑھ کے میں افسانہ اسرائیل کا
ڈر ہے غفلت سے نہ ہو تیرا مقدّر بھی وُہی

تیری دُنیا قوّت مذہب سے باقی ہے بکام
دین کے معیار سے موزوں ہے شعرِ زندگی

"سرو بایک مصرع از قیدِ خزاں آزاد شد
زندۂ جاوید می گردی اگر موزوں شوی"

۱۲ جولائی ۱۹۱۵ء

غزل

کیا مزا بُلبل کو آیا شیوۂ بیداد کا
ڈھونڈتی پھرتی ہے اُڑ اُڑ کر جو گھر صیّاد کا

کس بُتِ پردہ نشیں کے عشق میں ہوں مُبتلا
حسرتِ دل پر ہے بُرقع دامنِ فریاد کا

جب دُعا بہرِ اثر مانگی تو یہ پایا جواب
غیر رو کر لے گئے حصّہ تری فریاد کا

ہوں وہ ناداں ڈر سے زیرِ دامِ پنہاں ہو گیا
دُور سے چہرہ نظر آیا اگر صیّاد کا

سُن کے اسکو بے رُخی سی بھاگ جاتا ہے اثر
کیا اثر معشوق ہے اے دل تری فریاد کا

شرم آئی جب رگِ دل میں لہُو نکلا نہ کچھ
آب میں ہے غرق گویا نیشتر فصّاد کا

قمریوں نے باغ میں دیکھا ہی اس گلشن قد کو کیا
ہے چھُری ان کیلئے پتّہ ہر اک شمشاد کا

بھُول جاتے ہیں مجھے سب یار کے جور و ستم
مَیں تو دیوانہ ہوں اے اقبالؔ تیری یاد کا

زبانؔ دہلی - نومبر ۱۸۹۳ء

جان دیکر تمہیں جینے کی دُعا دیتے ہیں
پھر بھی کہتے ہو کہ عاشق ہمیں کیا دیتے ہیں

کوچۂ یار میں ساتھ اپنے سلایا ان کو
بختِ خفتہ کو مرے پاؤں دُعا دیتے ہیں

بدگمانی کی بھی کچھ حد ہے کہ ہم قاصد سے
قسمیں سَو لیتے ہیں جب ایک پتا دیتے ہیں

رحم آتا ہے ہمیں قیس کی عُریانی پر
دھجیاں دامنِ صحرا کی اُڑا دیتے ہیں

موت بازار میں بکتی ہے تو لادو مجھکو
ہمنشیں کس لئے جینے کی دُعا دیتے ہیں

ایسی ذلّت ہے مرے واسطے عزّت سے سوا
خود وُہ اُٹھ کر مجھے محفل سے اُٹھا دیتے ہیں

غیر کہتے ہیں کہ یہ بھول گیا ہے مُردہ
قبر پر میری جو وہ پھول چڑھا دیتے ہیں

موت لولی جو ہُوا کوچۂ قاتل میں گُذر
سر اسی راہ میں مردانِ خدا دیتے ہیں

انکو بتیاب کیا غیر کا گھر پھونک دیا
ہم دُعائیں تجھے اے آہِ رسا دیتے ہیں

گرم ہم پر کبھی ہوتا ہے جو وُہ بُت اقبال
حضرت داغ کے اشعار سُنا دیتے ہیں

زبان دہلی - فروری ۱۸۹۴ء

آبِ تیغِ یار تھوڑا سا نہ لے کر رکھ دیا

باغِ جنّت میں خدا نے آبِ کوثر رکھ دیا

آنکھ میں ہے جوشِ اشک اور سینے میں سوزاں ہے دل

یاں سمندر رکھ دیا اور واں سمندر رکھ دیا

ہے یقیں پھر جائے گا جب دیکھ لے گا وُہ صنم

غیر کے گھر آج مَیں نے اپنا بستر رکھ دیا

بعد مردن بھی نہ ڈالا بار کچھ احباب پر

قبر میں میرا صبا نے جسمِ لاغر رکھ دیا

نقشِ پائے غیر دیکھے ہیں جو کُوئے یار میں

رہ گزر میں مَیں نے خارِ جسمِ لاغر رکھ دیا

آمدِ خط سے ہُوا پوشیدہ کب چاہِ ذقن

خضر نے اک چشمۂ حیواں چُھپا کر رکھ دیا

ہنس کے پُوچھا اس صنم نے کون ہے تیرا رقیب
مَیں نے اس کے سامنے آئینہ لے کر رکھ دیا

کشتۂ رخسار کا ظاہر نشاں ہو اس لئے
قبر پر اس نے ہماری سنگِ مرمر رکھ دیا

خانۂ دِل دے دیا ہے داغِ اُلفت کے عوض
رہن مَیں نے اک درم پر آج یہ گھر رکھ دیا

ہو نہ جائے پردۂ انوارِ حق تیرا نقاب
تو نے گر اس کو اُٹھا کر روزِ محشر رکھ دیا

ہاتھ دھو بیٹھے آبِ حیواں سے خُدا جانے کہاں
خضر نے اس کو چھپا کر اے سکندر رکھ دیا

قصہ خوانِ یار کو بھیجا ہے لکھ کر حالِ دِل
ہاتھ میں قاصد کے مَیں نے ایک دفتر رکھ دیا

(زبان دہلی فروری ۱۸۹۴ء)

تصوّر بھی جو بندھتا ہے تو خالِ رُوئے جاناں کا

بلندی پر ستارا ہے شبِ تاریک ہجراں کا

نقاہت قیس کی بولی جو گزری پاس سے لیلےٰ

ذرا دامن بچانا یہ بھی کانٹا ہے بیاباں کا

جو ڈالی خاک مُٹھّی سے، کہا نالوں نے چلاّ کر

تجھے آتا نہیں سر پر اُٹھا لینا بیاباں کا

اُڑا جب طائرِ رنگِ حنا لیلےٰ کے ہاتھوں سے

وہیں پھندا بنایا قیس نے تارِ گریباں کا

جنوُں کو زخمِ دل کہتا ہے قائل میں بھی ہوُں تیرا

جو پھاہا بن کے آنکلے کوئی پُرزہ گریباں کا

جو وحشت میں کبھی مُوئے میانِ یار کو دیکھا

جنوں کہنے لگا یہ تار ہے تیرے گریباں کا

یہی کہتا ہے چاکِ دامنِ یُوسف زلیخا کو
مجھے ٹانکا لگے تارِ نگاہ پیرِ کنعاں کا

سمجھ کر اخترِ قسمت اُٹھا لیتے ہیں ہم اس کو
ستارا جب گرا کوئی ترے ماتھے کی افشاں کا

جنوں! تیرِ نگاہِ یار نے چھلنی کیا سینہ
نہیں مشکل رہا اب چھاننا خاکِ بیاباں کا

کبھی تیرِ جنوں دل میں ترازو ہو ہی جائے گا
کبھی کام آ ہی جائے گا مرے کانٹا بیاباں کا

حیا مانع رہی لیکن ادھر جذبِ محبّت تھا
کسی نے اُٹھ کے آخر روزنِ دیوار سے جھانکا

دمِ زورِ جنوں آخر اسی سے سر پٹکتا ہُوں
مرے سر پہ بڑا احسان ہے دیوارِ زنداں کا

رقیبوں کو جلاتی ہے تمھیں بے تاب کرتی ہے
تمھیں کہہ دو اثر کیا کم ہے میری آہِ سوزاں کا

غضب ہوگا کہیں اب وصل کا وعدہ نہ کر دینا
کہ خوگر ہو گیا ہوں مَیں شبِ تاریک ہجراں کا

بُرا ہو بدگمانی کا اسی پہ آنکھ رہتی ہے
نگہباں جانتے ہیں وہ مجھے اپنے نگہباں کا

بدل جائے اگر میرا مقدّر اس کی قسمت سے
قدم آنے نہ دُوں تیری گلی میں ایسے درباں کا

سمٹ کر تنگئ دل سے سویدا بن گیا آخر
خیال آیا اگر دل میں تری زلفِ پریشاں کا

مزا انکار میں ہے وصل کے اقرار سے بڑھ کر
کرشمہ ہے یہ سب شیرینئ تقریر جاناں کا

ہماری شورِ بختی کا اثر اتنا تو ہو یا رب

نہ ہو زخمِ جگر محتاج قاتل کے نمک داں کا

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر

مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخنداں کا

شورِ محشر لاہور دسمبر ۱۸۹۶ء

۱۸۹۷ء کے لگ بھگ عید رمضان کی تقریب پر حکیم امین الدین صاحب نے اپنے چند دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا جن میں اقبال بھی تھے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد شیخ عبدالقادر نے مومن کا یہ شعر پڑھ کر تجویز پیش کی کہ حضرت اقبال اور خان احمد حسین خاں اس پر فی البدیہہ غزل کہیں ؎

وعدۂ وصل سے ہو دل کو تسلی کیوں کر

فکر یہ ہے کہ وہ وعدے سے پشیماں ہو گا

اقبال نے اس موقعہ پر جو غزل کہی وہ حسب ذیل ہے ؎

لاکھ سرتاجِ سخن ناظمِ شرواں[1] ہو گا

پر مرے سامنے اِک طفلِ دبستاں ہو گا

مردِ مومن کی نشانی کوئی مجھ سے پُوچھے

موت جب آئے گی اس کو تو وُہ خنداں ہو گا

عشق کی راہ میں جو کوئی قدم رکھے گا

کبھی گریاں کبھی خنداں، کبھی عُریاں ہو گا

جو وفا پیشہ سمجھتا ہے خودی کو ایماں

جنّتی ہو گا فرشتوں میں نمایاں ہو گا

کیا کہیں مستِ مئے عشق کہاں ہوتا ہے

بہ درِ دیرِ مغاں ناصیہ کوباں ہو گا

---

[1] ناظمِ شرواں سے مراد خاقانی شروانی ہے۔

بجیتے جی سر نہ جھکائیں گے کسی کے آگے

مجھ پہ احسان نہ ہوگا تو یہ احساں ہوگا

زندگی چار دہاڑے ہے تو اس کی خاطر

بوالہوس ہوگا جو شرمندۂ احساں ہوگا

چار سُو پھولوں کا انبار نظر آتا ہے

شاید اس بزم میں اقبال غزل خواں ہوگا

مرقومۂ ذیل غزل اقبال نے طالب علمی کے زمانے میں حکیم امین الدین مرحوم کے مکان واقعہ اندرون بھاٹی دروازہ لاہور میں منعقدہ ایک مشاعرہ میں پڑھی تھی۔ اس مشاعرہ میں مرزا ارشد گورگانی بھی موجود تھے۔ انھوں نے اس کے ساتویں شعر پر بے حد داد دی تھی:۔

تم آزماؤ "ہاں" کو زباں سے نکال کے

یہ صدقے ہوگی میرے سوالِ وصال کے

کم بخت اِک "نہیں" کی ہزاروں ہیں صُورتیں
ہوتے ہیں سو جواب سوالِ وصال کے

ہم موت مانگتے ہیں وُہ گھبرائے جاتے ہیں
سمجھے اُنھوں نے اور ہی معنی "وصال" کے

اَے ضبط ہوشیار! مرا حرفِ مُدّعا
قابُو میں آ نہ جائے زبانِ سوال کے

مارے ہیں آسماں نے مُجھے تاک تاک کر
کیا بے خطا ہیں تیر کمانِ ھلال کے

ان کی گلی میں اور کچھ اندھیر ہو نہ جائے
اے ضعف! دیکھ مجھ کو گرانا سنبھال کے

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

میَں نے کہا کہ بے دہنی اور یہ گالیاں

کہنے لگے کہ بول ذرا مُنہ سنبھال کے

کہتے ہیں ہنس کے جائیے ہم سے نہ بولیے

قربان جاؤں طرزِ بیانِ ملال کے

بگڑے حیا نہ شوخیٔ رفتار سے کہیں

چلتے نہیں وُہ اپنا دوپٹہ سنبھال کے

تصویر میَں نے مانگی تو ہنس کر دیا جواب

عاشق ہوئے ہو تم تو کسی بے مثال کے

کہتا ہے خضر دشتِ جنوں میں مجُھے کہ چل

آتا ہوُں میَں بھی پاؤں سے کانٹا نکال کے

اقبالؔ لکھنؤ سے نہ دِلّی سے ہے غرض

ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

(بہار گلشن جلد دوم)

جادو عجب نگاہِ خریدار دل میں تھا
بکتا ہے ساتھ بیچنے والا بھی مال کے

چلتے ہوئے کسی کا جو آنچل سرک گیا
بولی حیا حضور! دوپٹہ سنبھال کے

حسرت نہیں کسی کی تمنّا نہیں ہُوں مَیں
مُجھ کو نکالئے گا ذرا دیکھ بھال کے

(روزگارِ فقیر حصّہ دوم)

(پُوری غزل کے بارہ شعر ہیں)

دیکھ لیتا ہُوں جہاں تنکا کوئی چُبھتا ہُوا
میں اُٹھا لیتا ہوں اپنے آشیانے کیلئے

ہم صفیر و تم مری عالی نگاہی دیکھنا
شاخِ نخلِ طور تاڑی آشیانے کے لئے

قصّہ خواں نے کیوں سُنادی داستاں مجھکو مری
رہ گیا تھا مَیں ہی کیا اپنے فسانے کیلئے

عشق نے مٹّی کو مسجودِ ملائک کر دیا
ورنہ انساں اور فرشتے سر جُھکانے کیلئے

صبحِ پیدائش یہ کہتا تھا کسی سے دردِ عشق	آنکھ رونے کیلئے دل ٹوٹ جانے کیلئے

ترک کر دی تھی غزل خوانی مگر اقبالؔ نے

یہ غزل لکھی ہمایوںؔ[1] کو سنانے کے لئے

(مخزن نومبر ۱۹۰۱ء)

دل کی بستی عجیب بستی ہے	لوٹنے والے کو ترستی ہے

ہو قناعت جو زندگی کا اصول	تنگ دستی فراخ دستی ہے

جنسِ دِل ہے جہان میں کمیاب	پھر بھی یہ شے غضب کی سستی ہے

تابِ اظہارِ عشق نے لے لی	گفتگو کو زباں ترستی ہے

ذکرِ جامِ طہور وعظ کا وعظ	مے پرستی کی مے پرستی ہے

شعر بھی اک شراب ہے اے دِل	ہوشیاری اسی کی مستی ہے

---

[1] میاں محمد شاہ دین ہمایوں بیرسٹرایٹ لاء۔

ہم فنا ہو گئے بھی فنا نہ ہوئے　　نیستی اک طرح کی ہستی ہے
آنکھ کو کیا نظر نہیں آتا؟　　ابر کی طرح سے برستی ہے

دیکھئے کیا سلوک ہو اقبال
مجرم جرم بت پرستی ہے

(مخزن مارچ ۱۹۰۲ء)

عاشق دیدار محشر کا تمنائی ہوا　　وہ سمجھتے ہیں کہ جرم ناشکیبائی ہوا
غیر سے غافل ہوا ہیں اے نمود حسن یار　　عرصۂ محشر میں پیدا کنج تنہائی ہوا
میری بینائی ہی شاید مانع دیدار تھی　　بند جب آنکھیں ہوئیں تیرا تماشائی ہوا
ہائے میری بدنصیبی وائے ناکامی مری　　پاؤں جب ٹوٹے تو شوق دشت پیمائی ہوا
میں تو اس عاشق کے ذوق جستجو پر مر مٹا　　ما عرفنا کہہ گئے جو تیرا تمنائی ہوا
تجھ میں کیا اے عشق وہ انداز معشوقانہ تھا　　حسن خود لولاک کہکر تیرا شیدائی ہوا

دیکھ ناداں امتیاز شمع و پروانہ نہ کر — حُسن بنکر عشق اپنا آپ سودائی ہوا

اب مری شہرت کی سُوجھی ہے انھیں دیکھے کوئی — پس کے مَیں حسبِ دم غُبارِ کوئے رُسوائی ہوا

بُعض اصحابِؓ ثلاثہ سے نہیں اقبالؔ کو

دق مگر اک خارجی سے آ کے مولائی ہوا

(مخزن اکتوبر ۱۹۰۲ء)

محبّت کو دولت بڑی جانتے ہیں — اسے مایۂ زندگی جانتے ہیں

وہ کیا قدر جانیں گے میری وفا کی — کہ ہوتے ہیں جو آدمی جانتے ہیں

نرالے ہیں انداز دُنیا سے اپنے — کہ تقلید کو خودکشی جانتے ہیں

تری چال دیکھی ہوئی ہے جنھوں نے — قیامت کو اک دِل لگی جانتے ہیں

کوئی قید سمجھے مگر ہم تو اے دِل — محبّت کو آزادگی جانتے ہیں

گداگر ہو اور بال ہوں سر کے لمبے — مسلمان اسکو ولی جانتے ہیں

حسینوں میں ہیں کچھ وہی ہوش والے — کہ جو حسن کو عارضی جانتے ہیں

بدلنا پڑا ہم نشیں نامہ بر کو — اسے واں کے سب آدمی جانتے ہیں

جو ہے گلشنِ طور اسے دل سمجھے ہم — اسی باغ کی اک کلی جانتے ہیں

کہا میں نے اقبال کو جانتے ہو؟

تو بولے یہ ہنس کر کہ جی! جانتے ہیں

بُرا ہوتا ہے عشقِ شعلہ رویانِ ستم گر بھی

یہ وہ آتش ہے جس میں خاک ہو جائے سمندر بھی

محبّت میں دلِ مضطر جبھی کچھ لطف اٹھتا ہے

کہ ہو معشوق ظالم بھی جفا جو بھی ستم گر بھی

بجا ہے شیخ جی سب کچھ مگر میں کس طرح مانوں

اجی حضرت! مرا دیکھا ہوا ہے آبِ کوثر بھی

وُہ ناکامِ تمنّا ہُوں اگر مَیں ڈوبنے جاؤں

تو اِک پانی کے قطرے کے لئے ترسے سمندر بھی

جناب داغؔ کی اقبالؔ یہ ساری کرامت ہے

ترے جیسے کو کر ڈالا سخنداں بھی سخنور بھی

پاس ہے اور ڈھُونڈتے ہیں اسے

کتنے غافل جہاں والے ہیں

دب کے رہتے نہیں کسی سے بھی

جو زمانے میں آن والے ہیں

تجھ کو اقبالؔ ان سے کیا نسبت

دِلّی والے زبان والے ہیں

چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دِکھائیں ہم
بن کر خیالِ غیر ترے دِل میں آئیں ہم

اچھی کہی شکایتِ جور و جفا کی بھی
اتنی سی بات کے لئے محشر میں جائیں ہم

اے صدمۂ فراق نہ کر ہم سے چھیڑ چھاڑ
تو کس کا ناز ہے کہ تجھے بھی اُٹھائیں ہم

پُوچھیں گے آج سُرمۂ دنبالہ دار سے
کس طرح سے کسی کی نظر میں سمائیں ہم

ہر چیز منع تو ہے مگر اے طبیبِ عشق
لیکن بڑھے جو ضُعف تو غش بھی نہ کھائیں ہم

(مخزن جنوری ۱۹۰۳ء)

دُشمن شبِ فراق میں ہے اپنا آپ ہی

آجائے موت اپنی تو گنگا نہائیں ہم

ڈرتے تھے جس کے واسطے وہ بات اب کہاں

تو ایک اب کہے تو تجھے سو سنائیں ہم

اقبال شعر کے لئے فرصت ضرور ہے

اس فکرِ امتحاں میں غزل کیا سنائیں ہم

(روزگارِ فقیر حصّہ دوم)

کھلا راز اُن پر مری بے بسی کا — الٰہی بھرم کھُل نہ جائے کسی کا

سوا اسکے اب قوم کو کام کیا ہے — امیروں کا شکوہ، گِلہ بے زری کا

خدا جانے کیا ہو گیا ہندیوں کو

کہ اس دیس میں راج ہے دشمنی کا

قطعہ

موت کی ظُلمت میں ہے پنہاں شرابِ زندگی
مر گیا ہُوں یُوں تو میں لیکن فنا کیونکر ہُوا
یُوں تو مرتے ہو ہنسی ٹھٹّھے پہ اے اقبالؔ تم
دِل تمھارا اس قدر درد آشنا کیونکر ہُوا

(مخزن فروری ۱۹۰۳ء)

نعت

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اُٹھا کر

وُہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار مُنہ کو چُھپا چُھپا کر

جو تیرے کوچہ کے ساکنوں کا فضائے جنّت میں دل نہ بہلا

تسلیاں دے رہی ہیں حُوریں خوشامدوں سے منا منا کر

بہارِ جنّت کو کھینچتا تھا ہمیں مدینہ سے آج رضواں

ہزار مشکل سے اس کو ٹالا بڑے بہانے بنا بنا کر

لحد میں سوئے ہیں تیرے شیدا تو حُورِ جنّت کو اس میں کیا ہے

کہ شورِ محشر کو بھیجتی ہے خبر نہیں کیا سکھا سکھا کر

تری جُدائی میں خاک ہونا اثر دکھاتا ہے کیمیا کا

دیارِ یثرب میں آ ہی پہنچے صبا کی موجوں میں مل ملا کر

شہیدِ عشقِ نبیؐ کے مرنے میں بانکپن بھی ہیں سو طرح کے

اجل بھی کہتی ہے زندہ باشی ہمارے مرنے پہ زہر کھا کر

رکھی ہوئی کام آہی جاتی ہے جنسِ عصیاں عجیب شے ہے

کوئی اسے پوچھتا پھرے ہے درِ شفاعت دکھا دِکھا کر

ترے ثنا گر عروسِ رحمت سے چھیڑ کرتے ہیں روزِ محشر

کہ اس کو پیچھے لگا لیا ہے گناہ اپنے دِکھا دِکھا کر

کرے کوئی کیا کہ تاڑ لیتی ہے لاکھ پردوں میں بھی شفاعت

رکھے تھے ہم نے گناہ اپنے ترے غضب سے چھپا چھپا کر

بتائے دیتے ہیں اے صبا ہم یہ گلستانِ عرب کی بو ہے

مگر نہ اب ہاتھ لا ادھر کو وہیں سے لائی ہے تو اُڑا کر

تری جدائی میں مرنے والے فنا کے تیروں سے بے خطر ہیں

اجل کی ہم نے ہنسی اڑائی اُسے بھی مارا تھکا تھکا کر

ہنسی بھی کچھ کچھ نکل رہی تھی مجھے بھی محشر میں تاکتی ہے

کہیں شفاعت نہ لے گئی ہو مری کتابِ عمل اُٹھا کر

اُڑا کے لائی ہے اے صبا تو جو بوئے زُلفِ معنبریں کو

ہمیں سے اچّھی نہیں یہ باتیں خدا کی رہ میں بھی کچھ دیا کر

یہ پردہ داری تو پردہ در ہے مگر شفاعت کا آسرا ہے

دبک کے محشر میں بیٹھ جاتا ہوں دامنِ تر میں منہ چھپا کر

شہیدِ عشقِ نبی ہوں میری لحد پہ شمعِ قمر جلے گی

اُٹھا کے لائینگے خود فرشتے چراغ خورشید سے جلا کر

جسے محبّت کا درد کہتے ہیں مایۂ زندگی ہے مجھ کو

یہ درد وہ ہے کہ مَیں نے رکھّا ہے دل میں اس کو چھپا چھپا کر

خیالِ راہِ عدم سے اقبالؔ تیرے در پہ ہوا ہے حاضر

بغل میں زادِ عمل نہیں ہے صلہ مری نعت کا عطا کر

غزل

چند روز ہوئے سیالکوٹ میں ایک تقریب تھی - یعنی وہاں کے رئیسِ اعظم آغا محمد باقر خاں صاحب قزلباش کے فرزندِ ارجمند محمد ناصر کے ختنہ کے غسلِ صحت کی شادی منائی گئی تھی - وہاں شیخ محمد اقبال صاحب بھی مدعو تھے - کسی نے ایک مصرع طرح دیا - جس پر یہ غزل ہوئی - اور اس غزل کو انھوں نے اپنے دوست کے بیٹے کی اس تقریب سعید کا سہرا قرار دیا - چنانچہ اس کی طرف مقطع میں اشارہ ہے - (مخزن - اپریل ۱۹۰۳ء)

لڑکپن کے ہیں دن صُورت کسی کی بھولی بھولی ہے
زباں میٹھی ہے لب ہنستے ہیں پیاری پیاری بولی ہے

ترا اے سیلِ دریائے محبّت مُنہ تکوں کب تک
مری کشتی جو تھی آپ اپنے ہاتھوں سے ڈبو لی ہے

کوئی شوخی تو دیکھے جب ذرا رونا تھا میرا

کہا بے درد نے "کیوں آپ نے مالا پرو لی ہے"

جفا جُو کہہ دیا مَیں نے مگر تُم نے بُرا مانا

خفا کیوں ہو گئے یہ عاشقوں کی بولی ٹھولی ہے

شبِ فرقت تصوّر تھا مرا اعجاز تھا کیا تھا

تری تصویر کو مَیں نے بُلایا ہے تو بولی ہے

وہ میری جُستجو میں پھر رہے ہیں خیر ہو یارب

پتا میرا بتانے کو قیامت ساتھ ہو لی ہے

سُنا ہے آج جنّت میں بڑی رونق کا جلسہ ہے

ترے کُشتہ کا ہے نیلام اور حُوروں کی بولی ہے

تماشائی کوئی آئینۂ ہستی میں ہے اپنا

مزا ہے حُسن نے اے دِل کتابِ عشق کھولی ہے

سمجھ سکتا نہ تھا کوئی مجھے اس بزمِ ہستی میں
گرہ تھی زندگی میری اجل نے آکے کھولی ہے

جگت ایشور ہے تو ہر آتما کو بیت ہے تیری
صنم خانہ کی یارب کیسی پیاری پیاری بولی ہے

ہمیں یادِ وطن، کیا پیش آتا ہے خدا جانے
بھلا تو کس لیئے غربت زدوں کے ساتھ ہولی ہے

تغیّر روز کا کچھ دید کے قابل نہ تھا نرگس
بتا پھر کس کے نظّارے کو تُو نے آنکھ کھولی ہے

تبسّم، چاکِ جیبِ گُل، ترنّم، نالۂ بلبل
یہ بے مہروں کی باتیں ہیں یہ بیدردوں کی بولی ہے

مہ و خورشید و انجم دوڑتے ہیں ساتھ ساتھ اس کے
فلک کیا ہے کسی معشوقِ بے پروا کی ڈولی ہے

یہ ہو گی شوخ اے صیّاد مدّت کی اسیری سے

نیا قیدی ہوں میں آواز میری بھولی بھولی ہے

لہو کی بوندیاں لالے کی کلیاں بن کے پھوٹی ہیں

مگر زیرِ زمیں کھیلی ترے کشتوں نے ہولی ہے

دیارِ عشق میں واماندگی رفتار ہے اے دِل

جسے کہتے ہیں خاموشی وہ اس بستی کی بولی ہے

گماں تجھ پر ہُوا تھا کیا دلِ بلبل کی چوری کا

صبا نے غنچۂ گُل ! کیوں گرہ تیری ٹٹولی ہے

گلِ مضموں سے اے اقبالؔ یہ سہرا ہے ناصرؔ کا

غزل میری نہیں ہے یہ کسی گلچیں کی جھولی ہے

اہلِ درد

چند روز ہوئے اقبالؔ۔ گرامیؔ اور بسملؔ تینوں حضرات ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ صاحب خانہ نے جو نوازشؔ نام اور تخلّص رکھتے تھے، ایک مصرع بہ ردیف" اہلِ درد" پڑھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اقبالؔ نے بیان کیا تھا کہ انھیں دردِ قولنج کی شکایت ہے اور اس وقت اسکے آغاز کے آثار معلوم ہوتے تھے۔ اس پر غزل کی فرمائش ہوئی۔ اور اقبالؔ نے بحالتِ درد مندرجہ ذیل دو غزلیں اس زمین میں کہیں۔ مولوی عبداللہ صاحب بسملؔ ایک فارسی قطعہ تمہیداً ان کیساتھ لکھ کر انھیں بغرضِ اشاعت بھیجتے ہیں۔

(مخزن مئی ۱۹۰۳ء)

زندگی دُنیا کی مرگِ ناگہانِ اہلِ درد

موت پیغامِ حیاتِ جاودانِ اہلِ درد

بند ہو کر اور کھلتی ہے زبانِ اہلِ درد

بولتا ہے مثلِ نے ہر استخوانِ اہلِ درد

یہ وہ پستی ہے کہ اس پستی میں ہے رفعت نہاں

سر کے بل گرتا ہے گویا نردبانِ اہلِ درد

آپ بائع آپ ہی نقد و متاع و مشتری

ساری دُنیا سے نرالی ہے دُکانِ اہلِ درد

اِس خموشی اور گویائی کے صدقے جائیے

محوِ شکرِ بے زبانی ہے زبانِ اہلِ درد

بیخودی میں یہ پہنچ جاتے ہیں اپنے آپ تک

عین بیداری نہ ہو خوابِ گرانِ اہلِ درد

کہہ رہی ہے ہر کلی گلزارِ ابراہیمؑ کی

آگ سے ہوتا ہے پیدا گلستانِ اہلِ درد

پالیا موسیٰؑ نے آخر بندۂ اللہ کو

درد والوں ہی کو ملتا ہے نشانِ اہلِ درد

اُن کی دُنیا بھی یہی عرشِ معلیٰ بھی یہی

دل مکانِ اہلِ درد و لامکانِ اہلِ درد

ہائے کیوں محشر پہ واعظ نے اُٹھا رکھی ہے بات

ہے اِسی دُنیا میں ہوتا امتحانِ اہلِ درد

درد ہی کے دم سے ہے ان دل جلوں کی زندگی

درد سے پیدا ہوئی رُوحِ روانِ اہلِ درد

لیتے ہیں داغِ محبّت سے گُلِ جنّت مُراد

ہائے کیا مرغوب ہے طرزِ بیانِ اہلِ درد

یہ اُجڑ جانے کو آبادی سمجھتے ہیں مگر

ڈھونڈتا ہے راہزن کو کاروانِ اہلِ درد

ارتجالاً ہم نے اے اقبالؔ کہہ ڈالے یہ شعر
تھی نوازش کو جو فکرِ امتحانِ اہلِ درد

دیگر

صبرِ ایّوبِ وفا خو جزوِ جانِ اہلِ درد
گریۂ آدم سرشتِ دودمانِ اہلِ درد
ہے سکوں نا آشنا طبعِ جہانِ اہلِ درد
جوں قمر سائر ہے قطبِ آسمانِ اہلِ درد
اوج یک مشتِ غبارِ آستانِ اہلِ درد
جوہرِ رفعت بلا گردانِ شانِ اہلِ درد
پھر رہے ہیں گلشنِ ہستی کے نظّاروں میں مست
نکہتِ گُل ہے شرابِ ارغوانِ اہلِ درد
ابتدا میں شرحِ رمزِ آیۂ لَا تَقْرَبَا

کس قدر مشکل تھا پہلا امتحانِ اہلِ درد

ہم نشیں رونا ہمارا کچھ نیا رونا نہیں

تھی ہم آہنگِ ندائے کن۔ فغانِ اہلِ درد

شورشِ محشر جسے واعظ نے ہے سمجھا ہؤا

ہے وہ گُل بانگِ درائے کاروانِ اہلِ درد

بُتکدے کی سمت کیوں جاتا ہے یا رب برہمن

کعبۂ دل ہی تو ہے ہندوستانِ اہلِ درد

گرمیٔ جوشِ عقیدت سے کیا کرتی ہے طوف

کعبۂ برقِ بلا ہے آشیانِ اہلِ درد

ذبح ہونا کوچۂ اُلفت میں ہے ان کی نماز

ہے صدا تکبیر کی گویا اذانِ اہلِ درد

دار پر چڑھنا نہ تھا معراج تھا منصور کو

تھی وہ سُولی درحقیقت نردبانِ اہلِ درد
موجِ خونِ سرمد و تبریزی و منصور سے

کس قدر رنگیں ہے یارب داستانِ اہلِ درد
تُو نے اَے انسان غافل آہ! کچھ پروا نہ کی

بے زباں طائر سمجھتے تھے زبانِ اہلِ درد
دیدۂ سوزن سے بھی رکھتے ہیں یہ پنہاں اسے

کوئی کیا دیکھے گا زخمِ بے نشانِ اہلِ درد
دیکھنے والے سمجھتے تھے دمِ عیسیٰؑ جسے

تھی وہ اک موجِ نسیمِ بوستانِ اہلِ درد
پھرتے رہتے تھے میانِ کوچۂ حبل الورید

ہے اسی آوارگی میں عزّ و شانِ اہلِ درد
کہدیا اقبال اک مصرع نوازش نے جو آج
وہ بہانہ ہو گیا بہرِ بیانِ اہلِ درد

غزل

جہاں زندگی ہے وہاں آرزو ہے
جہاں آرزو ہے وہاں جستجو ہے

نہ ہو جستجو تو ہے ویرانہ عالم
تری جستجو ہی تری آبرو ہے

نظر جب سے تیری نظر سے ملی ہے
جسے دیکھتا ہوں وہی خوبرو ہے

مٹاتے ہیں الفاظ معنی کی شوکت
مری بے زبانی مری گفتگو ہے

تری آرزو سے ملی وہ قناعت
نہ کوئی ہوس ہے نہ کچھ آرزو ہے

خودی نے عطا کی مجھے خود شناسی
ترا حسن دائم مرے روبرو ہے

نمایاں ہے کثرت میں وحدت کا جلوہ
جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

وہ کیا شے ہے اقبالؔ سینے میں تیرے
فرشتوں میں ہر دم تری گفتگو ہے

ہو شگفتہ ترے دم سے چمنِ دھر تمام

سیر اس باغ میں کر بادِ سحر کی صورت

نام روشن تو رہے عمر ہو گو برق خرام

زندگی چاہیئے دنیا میں شرر کی صورت

یہ تو بتلا دے مؤذن کہ تیری آنکھوں سے

کیا مروّت بھی گئی خوابِ سحر کی صورت

عشقِ یعقوبؑ کا تو محرمِ اسرار تو ہو

پیرہن دے گا دکھا تجھ کو پسر کی صورت

جوش زن بحرِ محبت تھا مگر دِل اپنا

صاف نکلا نگہِ دیدۂ تر کی صورت

دہر میں ذوقِ سکوں تجھ کو ہے پیغامِ فنا

تازہ رکھ جوشِ سفر شمس و قمر کی صورت

ضربِ شمشیرِ حوادث سے نہ کھو قوّتِ ضبط

سخت خود دار ہو دُنیا میں سپر کی صُورت

ہے گُل و لالہ کی صورت تو انھیں سی لیکن

ان میں پہ سوز نہیں قلب و جگر کی صُورت

لُطف جب آتا ہے اقبال سخن گوئی کا

شعر نکلے صدفِ دِل سے گہُر کی صُورت

(مخزن - مئی ۱۹۰۳ء)

دیگر

تو نہاں مُجھ سے مرے داغِ جگر کی صُورت

مَیں نہاں تُجھ سے ترے مُوئے کمر کی صورت

خیر، کیا بات ہے پتّھر ہے اگر دِل تیرا

ہم بھی اِس سنگ میں رہتے ہیں شرر کی صُورت

کُوچۂ عشق کے یہ راہ نُما بنتے ہیں

اللہ اللہ کوئی دیکھے تو خضر کی صُورت

وصل کی رات تو آخر ہوئی اے دامنِ صبر

چاک ہو تُو بھی گریبانِ سحر کی صُورت

گر پڑا شیشۂ دِل سنگِ درِ جاناں پر

یہ بھی ٹُوٹے گا یہیں کاسۂ سر کی صُورت

خون اب دِل میں نہیں اے رہِ اُلفت باقی

ختم ہو تو بھی کہیں زادِ سفر کی صُورت

کیوں نہ آنکھوں پہ بٹھاؤں تُجھے اے روزنِ در

تو دکھاتا ہے کسی رشکِ قمر کی صُورت

مَیں تو دیوانہ ہوا خیر کوئی بات نہ تھی

آپ کیوں پھر گئے لیکن مرے سر کی صُورت

غزل

پاس والوں کو تو آخر دیکھنا ہی تھا مجھے
نادرِ کا کوردی نے دُور سے دیکھا مجھے

اے حبابِ بحر، اے پروردۂ دامانِ موج
کچھ پتہ ملتا ہے تجھ سے اپنی ہستی کا مجھے

کیا کروں اے دلِ چمن آرائے عالم کا گلہ
ضبط کی طاقت نہ دی بخشا لبِ گویا مجھے

دل میں جو آتا ہے کہہ دُوں گا کہ مَیں مجبُور ہُوں
کوئی سمجھے یا نہ سمجھے کچھ نہیں پروا مجھے

کھُل گئی چشمِ تماشا اپنی جس دم اے کلیم
طُور ہر ذرّے کے دامن میں نظر آیا مجھے

قہر کر دینا نہ اَے صیّاد مُجھ کو چھوڑ کر

ہوگیا ہے قید سے کچھ پیار سا پیدا مُجھے

کس قدر تاریک تھی یارب مری صُبحِ نمود

آہ! اس ظُلمت نے مجھ سے بھی چھپا رکھّا مجھے

حالِ دل کس سے کہوں اے لذّتِ افشائے راز

ایک بھی اِس دیس میں محرم نہیں مِلتا مُجھے

رہتے ہیں بے درد میری چشمِ تر پر خندہ زن

اے دلِ درد آشنا تو نے کیا رُسوا مجھے

یُوں بگڑنا میری خود بینی پہ اب زیبا نہیں

اپنی صُورت پر کیا تھا تُو نے کیوں پیدا مجھے

نزر چلی آتی ہے کچھ صُبحِ ازل سے اپنی آنکھ

جب سے روتا ہُوں کہ آتا بھی نہ تھا رونا مجھے

یاد دُنیا کی کہاں باقی ہے اے اہلِ عدم
ہاں یُونہی سا یاد ہے کُچھ اپنا مرجانا مُجھے

ہے بسیرا اِک نئی ڈالی پہ مدّت سے مگر
یاد آتا ہے پُرانا آشیاں اپنا مجھے

موت یہ میری نہیں میری اجل کی موت ہے
کیوں ڈروں اس سے کہ مرکر پھر نہیں مرنا مجھے

نادر و نیرنگ ہیں اقبال میرے ہم صفیر
ہے اسی تثلیث فی التّوحید کا سَودا مُجھے

خدنگ نظر۔ اگست سنہ ۱۹۰۲ء

یہ شعر بھی اسی غزل کے ہیں ؎

دِل کو ہے اندر ہی اندر جُستجو تیری مگر
کیا قیامت ہے کہ سمجھا تُونے بے پروا مجھے

جا تو نکلوں وادیٔ ایمن میں مَیں بھی اے کلیم

لن ترانی کہہ نہ دے وُہ شوخِ بے پروا مُجھے

ہر کسی کو بزمِ ہستی میں ہے رونا موت کا

اور اس محفل میں رونا زندگانی کا مُجھے

وہ گئے شہر خموشاں میں تو یہ آئی صدا

او گزرنے والے، ٹھوکر سے مٹا جانا مُجھے

لِکھ دیا تھا مَیں نے کیا خط میں کہ آیا یہ جواب

کچھ سمجھ کر آپ نے یہ خط لِکھا ہونا مُجھے

کس غضب کا رنگ لائی ہے سیہ کاری مری

مغفرت نے بھی نہ روزِ حشر پہچانا مُجھے

(روزگارِ فقیر حصّہ دوم)

عبادت میں زاہد کو مسرور رہنا
مجھے پی کے تھوڑی سی مخمور رہنا

دمِ آفرینش ہدایت تھی دل کو
کلیم تماشائے ہر طور رہنا

مقدر کی تقسیم ہوتی تھی جس دم
پسند آگیا دل کو مجبور رہنا

سکھائی ہے کس نے تمھیں بے حجابی
حسینوں کا شیوہ ہے مستور رہنا

عجب شیوۂ عاشقی ہے جہاں میں
نہ معذور رکھنا نہ معذور رہنا

تمھیں کیا بتائیں محبت ہے کیا شے
یہ ہے دل کے ہاتھوں سے مجبور رہنا

دکھاوے کی بے اعتنائی کے صدقے
بڑے کام آیا مجھے دور رہنا

نبھائینگے کیا ایک سے وہ محبت
جنھیں ہر نظر میں ہو منظور رہنا

نہیں عشق بازی یہ زاہد تو کیا ہے
اسیرِ خمِ گیسوئے حور رہنا

کوئی چال اِس خاکساری میں ہوگی
تمھاری تو عادت تھی مغرور رہنا

نہ میں تم کو دیکھوں نہ اغیار دیکھیں
مری آنکھ میں صورتِ نور رہنا

نہ ہو جن کی آنکھوں میں تابِ نظارا
بھلا اُن غریبوں سے کیا دور رہنا

وہ سو نازِ اقبال پر کر رہے ہیں
زمانے میں ہے ان کو مشہور رہنا

(بہارِ گلشن جلد دوم - مخزن - اگست ۱۹۰۳ء)

تم نے آغازِ محبّت میں یہ سوچا ہوگا
کِس طرح کا یہ نیا چاہنے والا ہوگا
تُم نے سمجھا تو ہے اِس گھر کو ہمارا لیکن
اب ہمارا ہے کوئی دِن میں تمھارا ہوگا
حشر میں کچھ تو تمھیں حُسن پہ ہوگی اُمید
کچھ مرا شکوہ نہ کرنے کا بھروسا ہوگا
گھر میں بیٹھے ہیں خُدا رکھّے کہ باہر ہیں کہیں
نامہ بر یہ بھی کسی نے تجھے پُوچھا ہوگا

نامہ بر کام تو باتوں میں بنا کرتے ہیں

مان جائیں گے اگر تم کو سلیقا ہو گا

ہاں سُنا پہلے ہمیں اُن کو کہے گا کیا کیا

نامہ بر ہم جو بتائیں وُہی کہنا ہوگا

ہم کہیں جائیں کسی کام کو جائیں لیکن

دِل یہ کہتا ہے اُسی رہ سے گذُرنا ہو گا

تیرے اشعار میں اقبال یہ رنگت تو نہ تھی

تو نے کم بخت کسی شوخ کو تاکا ہو گا

(بہارِ گلشن جلد دوم)

یہ جوانی کے ولولے اے دِل　　دو گھڑی کا اُبال ہوتے ہیں

میری فُرقت میں تم مرو، توبہ　　یہ حسینوں کے جال ہوتے ہیں

زور تُم اپنی کم سِنی پہ نہ دو — سب حسیں خورد سال ہوتے ہیں

ہائے وُہ مار ڈھیلے ہاتھوں کی — کس مزے کے ملال ہوتے ہیں

ذکر کچھ آپ کا بھی ہے ان میں — قبر میں جو سوال ہوتے ہیں

اُف رے نازک مزاجیاں تیری — بات میں سَو ملال ہوتے ہیں

جن کی سیرت بھی دِل کو بھڑکا دے — وُہ حسیں خال خال ہوتے ہیں

عاشقوں سے یہ پُوچھتا ہے کوئی — کس طرح پائمال ہوتے ہیں

شعرِ اقبال سے نہ ہو حیراں
آدمی باکمال ہوتے ہیں

بے حجابی بھی ہے تو ایسی ہے — جس میں پردے کی شان ہے گویا

ہے کشش پر مدار ہستی کا — عشق جانِ جہان ہے گویا

جب سے دل میں ہوُا گزر تیرا — یہ مکاں، لامکان ہے گویا

کہتے ہیں دیکھ کر خموش مجھے   یہ بڑا کم زبان ہے گویا
عذرِ ناسازئ مزاج نہیں   صبر کا امتحان ہے گویا
زندگانی کا اعتبار نہیں   آدمی میہمان ہے گویا
تُم مرے دل میں رہتے سہتے ہو   یہ تمھارا مکان ہے گویا
عشق کی راہ و رسم اُلٹی ہے   یاں خموشی زبان ہے گویا

اہلِ دِل ہی اِسے سمجھتے ہیں
شعر دل کی زبان ہے گویا

اکتوبر ۱۹۰۴ء میں سیالکوٹ سے "الکاشف" نام ایک ماہنامہ قاضی حمید الدین مالک وایڈیٹر نے منشی فیض علی پروپرائٹر سے چھپوا کر شائع کیا تھا۔ اس کے پہلے پرچے میں یہ غزل چھپی تھی :۔

جو مضموں زندگی میں[1] حرفِ موزوں بن کے نکلے ہیں

وُہی طائر بھی آخر گنبدِ مدفن سے نکلے ہیں

سبب اے ہم نشینو کچھ نہ پُوچھو میرے رونے کا

یہ ارماں ہیں کہ جو آنکھوں سے آنسو بن کے نکلے ہیں

نہ تڑپایا کسی کو تیرے نظّارے کے ارماں نے

کہ سارے دیکھنے والے تری چلمن کے نکلے ہیں

کبھی اس راہ سے شاید سواری تیری گُذری ہے

کہ میرے دل میں نقشِ پا ترے توسن کے نکلے ہیں

کیا حیراں فرشتوں کو بھی تیرے دردمندوں نے

خدا جانے تری محفل سے یہ کیا بن کے نکلے ہیں

---

[1] روزگارِ فقیر میں یہ مصرع یوں ہے ع

جو مضموں میرے دِل سے حرفِ موزوں بنکے نکلے ہیں

کوئی کیا جانے[۱] ہے وسعت فزا یاں کی ہوا کیسی

تری درگاہ سے ذرّے بیاباں بن کے نکلے ہیں

مری جاں، داستاں میری کلیجہ تھام کر سُننا

کہ میرے حال پہ آنسو مرے دُشمن کے نکلے ہیں

مسافر من چلے ہوتے ہیں کیا راہِ محبت کے

متاعِ دِل کو لے کر واسطے رہزن کے نکلے ہیں

کرامت دیکھ اے دستِ جنوں بادِ محبت کی

عرب میں جا کے پُرزے میرے پیراہن کے نکلے ہیں

رفو اے بخیہ گر چاکِ محبت ہو تو کیوں کر ہو

مرے زخموں پہ آنسو دیدۂ سوزن کے نکلے ہیں

---

[۱] روزگارِ فقیر میں اس مصرع کی صورت یہ ہے کہ

خدا جانے یہاں کی ہے ہوا وسعت فزا کیسی ؟

چلے جاتے ہیں سیدھے پھر ادھر کا رُخ نہیں کرتے
جو مثلِ بُو نظارے چھوڑ کر گلشن کے نکلے ہیں

جو اپنی کشت زارِ دل کو مَیں نے اے فلک دیکھا
تارے بھی ترے دانے مرے خرمن کے نکلے ہیں

تعلق پھول ہیں گویا ریاضِ آفرینش کے
مگر دیکھا تو کانٹے بھی یہی دامن کے نکلے ہیں

برہمن روزِ محشر ڈھونڈتا پھرتا ہے واعظ کو
صنم جو تھے وُہ پتھر وادیٔ ایمن کے نکلے ہیں

تماشا کی جو وسعت میں نے اپنے دامنِ دل کی
ہزاروں دشت اِک گوشے میں اس دامن کے نکلے ہیں

وُہ مذبوحِ ازل ہُوں مَیں کہ خنجر سب حسینوں کے
پُرانے آشنا میری رگِ گردن کے نکلے ہیں

مجھے اقبالؔ اس سیّد کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اُسکے دامن میں ہیں وُہ کچھ بنکے نکلے ہیں

مندرجہ ذیل تین اشعار بھی اسی غزل کے ہیں جو "روزگارِ فقیر" سے لئے گئے ہیں ؎

پسند آئی نہ اُن کو سیرِ نخلستانِ ایمن کی
مگر صحرائے یثرب میں وہ کیا بن ٹھن کے نکلے ہیں

گلستانِ جہاں میں مثلِ بُلبل اُڑتے پھرتے ہیں
قلم سے شعر گویا میرے پریاں بن کے نکلے ہیں

جنھوں نے مثلِ شبنم اس چمن میں آپ کو دیکھا
وہی عاشق کسی کے چہرۂ روشن کے نکلے ہیں

دِل ترے شوق میں جب درد سے بے تاب ہُوا

اشک جو آنکھ سے ٹپکا دُرِ نایاب ہُوا

جوشِ ایماں جو دکھاؤں تو اُلٹ دوں یہ جہاں

دِل نہ سینے میں ہُوا قطرۂ سیماب ہُوا

عقل کی فوج نے ہر جنگ میں منہ کی کھائی

عشق میدان میں آیا تو ظفر یاب ہُوا

کر نہ تقدیر کے شکوؤں سے خودی کو رُسوا

بہرِ تدبیر عیاں عالمِ اسباب ہُوا

تیرے پرتو سے ہے ہر چیز میں نورِ ایماں

گلشنِ دہر ترے حُسن سے شاداب ہُوا

قلبِ انساں سے چلی آتی ہے فطرت کی صدا

خود کو جو جان گیا سمجھو خدایاب ہُوا

اس کی اِک ضرب ہے، زلزلہ طاری ہر سُو

زورِ مُسلم نہ ہُوا، خیال ہُوا خواب ہُوا

کون جانے کہ قلندر ہے شہنشاہِ عشق

فرشِ خاکی بھی مجھے فقر میں کم خواب ہُوا

ہر ضرورت[1] ہوئی پُوری تو خدا سے اقبالؔ

مَیں نہ تکلیف میں شرمندۂ احباب ہُوا

خارِ صحرا نہ سہی دشت کے پتھّر ہی سہی

میرا چھالا نہیں پھُوٹا تو مقدّر ہی سہی

روزِ محشر کوئی مے خوار نشے میں بولا

مے احمر نہیں ملتی ہے تو کوثر ہی سہی

---

[1] بیاض خورشید الحسن صاحب میں اس مصرع کی صورت یوں ہے ؎

جو ضرورت ہوئی بس کہہ کہ خدا سے اقبالؔ

حشر کے روز مرا دستِ جنوں کہتا ہے
اب کہاں جائیں، چلو دامنِ محشر ہی سہی

تیغِ ابرو جو نہیں ہے تو رگِ جاں کے لئے
مژہٗ یار کا چبھتا ہؤا نشتر ہی سہی

مجھے صیّاد نہ دام پھڑک جانے دے
مَیں نہ گلشن میں رہوں گا تو مرے پر ہی سہی

لوگ کہتے ہیں کہ مشکل ہے عدم کی منزل
جیتے جی کاٹ تو لی کیا ہؤا مر کر ہی سہی

کس کو یاد آؤں گا میں حشر کے ہنگامے میں
میرا دفتر ہے گناہوں کا تو دفتر ہی سہی

ان کو کافر جو کہیں ہم تو یہ ملتا ہے جواب
تم کو اسلام مبارک ہو مَیں کافر ہی سہی

جب کہا آپ ستمگر ہیں تو فرماتے ہیں

آپ کہتے ہیں ستمگر تو ستمگر ہی سہی

شعر اقبالؔ کو آتا نہیں کہنا لیکن

تم جو کہتے ہو سخنور تو سخنور ہی سہی

یہ غزل علاّمہ مرحوم نے کیمبرج سے لکھ کر عطیّہ بیگم صاحبہ کو بھیجی تھی - اور بیگم صاحبہ نے جو مجموعہ علاّمہ کے خطوط کا شائع کیا ہے اس میں یہ موجود ہے:-

اے گُل ز خارِ آرزو آزاد چوں رسیدۂ ۔۔۔ تو ہم ز خاک ایں چمن مانند ما دمیدۂ

اے شبنم از فضائے گل آخر ستم چہ دیدۂ ۔۔۔ دامن ز سبزہ چیدۂ تا بہ بفلک رمیدۂ

با من مگو کہ مثلِ گل ہمراہِ شاخ بستہ باش ۔۔۔ مانند موجِ بُو مرا آوارہ آفریدۂ

از لوحِ خویش بازپرس قصۂ جرم ہائے ما ۔۔۔ آخر جوابِ ناسزا از لبِ ما شنیدۂ

ہنگامۂ دیر یکطرف شورشِ کعبہ یکطرف ۔۔۔ از آفرینشِ جہاں دردِ سرے خریدۂ

ہستیم ما گدائے تُو یا تو گدائے ما ستی
بہر نیاز سجدۂ در پس ما دو یدہٗ

افتی اگر بدستِ ما حلقہ بگرد تو کشیم
ہنگامہ گرم کردۂ خود از میاں رمیدۂ

اقبالؔ غربتِ توام نشتر بہ دل ہمی زند
تو در ہجوم عالمے یک آشنا نہ دیدۂ

ہے کلیجا فگار ہونے کو
دامنِ لالہ زار ہونے کو

عشق وُہ چیز ہے کہ جس میں قرار
چاہیئے بے قرار ہونے کو

جستجوئے قفس ہے میرے لئے
خوب سمجھے شکار ہونے کو

پیس ڈالا ہے آسماں نے مجھے
کس کی رہ کا غبار ہونے کو

یار جانی کہیں نہیں ملتا
یُوں تو ہوتے ہیں یار ہونے کو

کیا ادا تھی وہ جاں نثاری میں
تھے وُہ مجھ پر نثار ہونے کو

لالہ اور داغِ دل بہانہ ہے
دل جلوں میں شمار ہونے کو

زخم اور سوزنِ رفو توبہ | کھل گیا بستہ کار ہونے کو
وعدہ کرتے ہوئے نہ رُک جاؤ | ہے مجھے اعتبار ہونے کو
اس نے پُوچھا کہ کون چھپتا ہے | ہم چُھپے آشکار ہونے کو

ہم نے اقبال عشق بازی کی
پی یہ مے ہوشیار ہونے کو

حقیقت میں رُوحِ ابد ہے زمانہ | یہ امروز و فردا ہیں تیرا فسانہ
نہ ہو جب تلک دِل میں ایمانِ کامل | خودی بھی فسانہ خدا بھی فسانہ
خودی کی حفاظت کوئی مجھ سے سیکھے | غریبی میں انداز ہیں خسروانہ
فرنگی کی دُنیا فسُوں سامری کا | ادا دلبرانہ عمل ساحرانہ
سزا پانے والی ہے یورپ کی غفلت | کہ فطرت بھی رکھتی ہے اک تازیانہ
نہ ہو گر یقیں دیکھ لے سر جُھکا کر | ترے دِل میں ہے دفن تیرا فسانہ

سفر میں نہ منزل کا رکھ کچھ تخیّل
جلا دے کسی برق سے آشیانہ

کوئی مردِ مومن جگا دے یہ بستی
طریقے ہیں مشرق کے سب بے اہبانہ

پتنگے ہیں نابود اور شمع گریاں
ہوئی ختم حسرت پہ بزمِ شبانہ

سکھاؤ اب اقبالؔ کچھ قاہری بھی
بہت کہہ چکے قصۂ عاشقانہ

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

مری جاں نہیں ربط غیروں سے اچھا
بھلا میں تمھارا برا چاہتا ہوں

مجھے جلوۂ گل ہے برقِ تجلّی
سنبھالو مجھے میں گرا چاہتا ہوں

نہ کوثر کا خواہاں نہ حوروں کا شیدا
خدا جانے میں کیا ہوں کیا چاہتا ہوں

اُگوں سبز ہو ہو پس کے ہوں خون آخر
میں قسمت مثالِ حنا چاہتا ہوں

شجر ہوں گری مجھ پہ برقِ محبّت
ہوا ہو گیا ہوں بھلا چاہتا ہوں

مری جاں تری بے حجابی سے پہلے — تری دید کا حوصلہ چاہتا ہُوں

محبّت مٹا دے گی بے گانگی کو — سنبھل بیٹھے ہیں تو ہوا چاہتا ہُوں

ہُوا خاک ہیں تو ہوائے محبّت — مدینے کی جانب اُڑا چاہتا ہُوں

چلو مِل کے اقبالؔ کے گھر کو ڈھُونڈیں

کہ میں بھی اُسے دیکھنا چاہتا ہُوں

بلاکشانِ محبّت کی یادگار ہُوں میں

مِٹا ہُوا خطِ لوحِ سرِ مزار ہُوں میں

فنا ہوئے پہ بھی گویا وفا شعار ہُوں میں

جو مِٹ گیا تو حسینوں کا اعتبار ہُوں میں

کبھی نہ گوشِ سماعت سے شرمسار ہُوں میں

وہ راز ہُوں کہ زمانے پہ آشکار ہُوں میں

نگاہ سے نہ کہیں صُبح کو اُتر جاؤں
شبِ وصال کسی کے گلے کا ہار ہُوں میں

نسیمِ صُبح نہ چھیڑے مجھے کہ دامن سے
کسی کے ہاتھ کا جھاڑا ہُوا غبار ہُوں میں

نشے میں مست سمجھتا ہے مجھ کو کیوں واعظ
وُہ اپنا وعظ کہے جائے ہوشیار ہُوں میں

تمھاری شوخ نگاہی نے بڑھ کے کیا پھُونکا
قرار بھی مجھے آئے تو بے قرار ہُوں میں

تڑپ کے شانِ کریمی نے لے لیا بوسہ
کہا جو سر کو جھکا کر گنہگار ہُوں میں

کسی طرح سے مری بام تک رسائی ہو
فغانِ خاک نشینانِ کوئے یار ہُوں میں

رہی نہ زہر میں اقبال وُہ پُرانی بات
کسی کے ہجر میں جینے سے شرمسار ہوں میں

جس کو شُہرت بھی ترستی ہے وہ رُسوا اور ہے
ہوش بھی جس پر بھڑک جائیں وُہ سَودا اور ہے

بن کے پروانہ ترا آیا ہُوں میں اے شمعِ طُور
بات پھر وُہ چھڑ نہ جائے یہ تقاضا اور ہے

اور کچھ اندھیر کر دینا نہ اے نُورِ سحر
ہجر کی شب ہے ابھی مجھ کو تڑپنا اور ہے

یُوں تو اے صیّاد آزادی میں ہیں لاکھوں مزے
دام کے نیچے پھڑکنے کا تماشا اور ہے

دیکھ اے ذوقِ تکلّم یاں کوئی مُوسیٰ نہیں

جو مری آنکھوں میں پھرتا ہے وُہ نقشا اور ہے

قیس پر یُوں طعنہ زن ہوتی ہے لیلےٰ دشت میں

جس کے کانٹے دِل میں چُبھتے ہیں وُہ صحرا اور ہے

وہ صفِ محشر میں کہتے ہیں مجُھے پہچان کر

تم وُہی اقبال ہو لو مَیں نے جانا اور ہے

عیاں ستارے، ہویدا فلک، زمیں پیدا

تری خدائی تو پیدا ہے، تو نہیں پیدا

عجیب جامۂ ہستی مِلا ہے اِنساں کو

کہ جس کی جیب نہ دامن نہ آستیں پیدا

وُہ چیز نام ہے جس کا تڑپ محبّت کی

مرے وطن میں نہیں ہے ابھی کہیں پیدا

جو دیکھنا ہو تو چشمِ نیاز پیدا کر

ہر ایک ناز سے ہے ناز آفریں پیدا

نگاہ میں نہیں رہتا وُہ نُورِ بینائی

دلوں میں ہوتا ہے جس دم غبارِ کیں پیدا

پھر آیا دیس میں اقبالؔ بعد مُدّت کے

پس از سہ سال ہوا گم شُدہ نگیں پیدا

کسی ادب کی جو قسمت بگڑتی ہے اقبالؔ

تو پہلے ہوتے ہیں نادان نکتہ چیں پیدا

مندرجہ ذیل اشعار کے علاوہ باقی اشعار بانگِ درا میں موجود ہیں:۔

ٹھہرنا ذرا، سُن کے کم بخت آتا   وہاں نامہ بر! آج تکرار کیا تھی

مرا دل بھی اُٹھنے کو چاہا نہ واں سے   فسوں تھا کوئی، بزمِ اغیار کیا تھی

کوئی یوں گیا ہے ادھر سے نکل کر　　قیامت تھی بجلی تھی رفتار کیا تھی

نہ وعدہ کسی نے کیا کیا سمجھ کر　　مری بزم تھی بزمِ اغیار کیا تھی

نہ چھوڑا کبھی بیوفائی نے تم کو　　مری طرح یہ بھی وفادار کیا تھی

ترے ساتھ اُڑتی گئی راہ گذر میں　　مری خاک اے دامنِ یار کیا تھی

چُھپائی ہے زاہد کوئی چیز تُو نے　　یہ شے تیرے قرباں مرے یار کیا تھی

قفس میں ہے بلبل تو ویراں چمن ہے　　یہی رونقِ رنگِ گلزار کیا تھی

ہزاروں کلیجے کو تھامے ہُوئے ہیں　　الٰہی وُہ چشمِ فسوں کار کیا تھی

سلیقہ نہ تھا بات کرنے کا تم کو　　مجھے یاد ہے میری سرکار کیا تھی

لیا مغفرت نے تڑپ کر بغل میں
کرامت تھی شرمِ گنہگار کیا تھی

(مخزن - جون ۱۹۰۱ء)

اثر غضب کا دُعائے قدح میں ہے ساقی
کوئی اسے بھی ذرا داخلِ نماز کرے

جواب ملتا ہے لولاک ما عرفنا کا
کوئی جو عجز کے دامن کو پایِ دراز کرے

پُرانے کفر کو تازہ کروں یہ کہہ کہہ کر
مدینہ وہ ہے کہ کعبہ جدھر نماز کرے

شعاعِ نور کو تاریکیٔ جہاں میں ڈھونڈ
یہی ہے شمع اگر دِل کو تو گداز کرے

نہیں ہے فرق محبت میں اور غلامی میں
یہ عشق وُہ ہے کہ محمود کو ایاز کرے

مَیں تاریکی ہوں لیکن مجھ میں پوشیدہ وُہ گوہر ہے
جھلک جس کی عیاں ہے اے فلک تیرے نگینوں میں

کہیں لیلےٰ نے شاید دیکھ پائی ہے جھلک تیری
کہ محمل سے نکل کر جا ملی صحرا نشینوں میں

مَیں اے خضرِ محبت ڈھونڈتا ہوں اس ولایت کو
جہاں سبزے کی صورت طور اُگتے ہیں زمینوں میں

سَو سَو اُمید بندھتی ہے اِک اِک نگاہ پر
مُجھ کو نہ ایسے پیار سے دیکھا کرے کوئی

دے کر جھلک سی آپ تو پردے میں ہو رہے
اور کہہ گئے نگاہ کو ڈھُونڈا کرے کوئی

بولے بھی سُن کے قصّۂ ہجراں تو یہ کہا
کی دِل لگی تو یہ بھی گوارا کرے کوئی

ہم جانتے ہیں میم کے پردے میں کون ہے
ہاں بھیدیوں سے منہ نہ چھُپایا کرے کوئی

صبحِ ازل یہ دردِ محبت نے دی صدا
مجھ کو بھی ساتھ حُسن کے پیدا کرے کوئی

محفل میں شغلِ مے ہو شبِ ماہتاب ہو
اور مَیں گروں تو مجھ کو سنبھالا کرے کوئی

اقبالؔ عشق نے تیرے سب بل دِئے نکال
مدّت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

مخزن اپریل ۱۹۰۳ء

بیابانوں میں اے دل اہلِ دِل کی جستجو کیسی
کریں جو پیار اِنساں سے وُہی اللہ والے ہیں
غضب کے مَن چلے ہیں جنسِ دل کے بیچنے والے
یہ اپنے مال کے ساتھ آپ بھی بک جانے والے ہیں
پتہ یُوں تو بتاتے ہیں وُہ سب کو لامکاں اپنا
ہمیں معلوم ہے اَے دل جہاں کے رہنے والے ہیں
پلا دی اس کو کیا مے ساقیٔ بادِ بہاری نے
زبانِ برگِ گُل پہ قطرۂ شبنم کے چھالے ہیں

نہ دیکھ اے دیدۂ خوں بار دِل کو کم نگاہی سے

ترے آنسو اسی اُجڑے ہُوئے گُلشن کے لالے ہیں

دُعا دیتا ہُوں، روتا ہوں، گلہ کرتا ہُوں قسمت کا

ہزاروں ڈھنگ اظہارِ تمنّا کے نکالے ہیں

الٰہی کون سا مالی ہے اس دِل کے گُلستاں کا

اُمیدوں کے شجر، زخموں کے گُل، داغوں کے لالے ہیں

نہیں کچھ امتیازِ ما و تُو شہرِ محبّت میں

نرالا دیس ہے دستُور ہی یاں کے نرالے ہیں

نشانِ ماہِ کنعاں اے زلیخا پُوچھ لے مجھ سے

کہ مَیں نے چاہِ دل سے سینکڑوں یوسف نکالے ہیں

(دکن ریویو جلد ۲ نمبر ۸ سنہ ۱۹۰۴ء)

پوری غزل کے اُنیس شعر ہیں۔ جو شعر بانگِ درا میں نہیں،
ہیں صرف ان کو درج ذیل کیا جاتا ہے :۔

حباب آسا سرِ موجِ نفس باندھا ہے محمل کو
ذرا دیکھ اے شرر ذوقِ فنا مُجھ کو کہاں تک ہے

وہی اک شعلہ ہے تربت بھی ہے اور شمع تُربت بھی
مزا مرنے کا کچھ پروانۂ آتش بجاں تک ہے

نہ سیکھی تُونے مرغِ رنگِ گل سے رمزِ آزادی
یہ قیدِ بوستاں بُلبل خیالِ آشیاں تک ہے

بنائیں چارہ گر نے دیدۂ حیراں کی زنجیریں
نظر آسا مری وحشت میں بیتابی یہاں تک ہے

مَیں خارِ خشک پہلو شعلۂ گلخن کے قابل ہُوں
پڑے رہنا مرا گُلشن میں رحمِ باغباں تک ہے

مثالِ عکسِ بے تارِ نفس ہے زندگی میری
تری آسیب کاری اے اجل اقلیم جاں تک ہے

زباں تک عقدۂ بُت خانہ بن کر رہ گیا مطلب
ارے مجھ دِل جلے کی بستہ کاری کا کہاں تک ہے

نہیں منّت پذیرِ چشم رونا شمعِ سوزاں کا
سمجھ غافل گدازِ دِل میں آزادی کہاں تک ہے

بھلا اے گُل کبھی اس رمز کو بھی تُو نے سمجھا ہے
تری شبنم فریبی کیوں بہارِ بوستاں تک ہے

یہ ہے اقبالؔ فیضِ یادِ نامِ مرتضائی جس سے
نگاہِ فکر میں خلوت سرائے لامکاں تک ہے

(مخزن اکتوبر ۱۹۰۳ء)

حشر کو مانتا ہوں بن دیکھے ہائے ہنگامہ اس کی محفل کا

سدِ رہ گرچہ تھی صعوبتِ راہ لے اُڑا اشتیاق منزل کا

تھی غضب طرزِ پُرسشِ ہمدرد لب پہ آیا ہے مُدّعا دِل کا

جلوۂ گُل کا ہے اِک دام نمایاں بُلبل

اس گلستاں میں ہیں پوشیدہ کئی دام ابھی

ہم نوا لذّتِ آزادیٔ پرواز کجا

بے پری سے ہے نشیمن بھی مجھے دام ابھی

جنھوں نے میری زبانِ گویا کو محشرستانِ صدا کا جانا

مرا وہ دِل پھیر کر جو دیکھیں تو واں سکوتِ مزار ہوگا

جو نکلی نالہ بن کر غنچۂ منقارِ بلبل سے

وُہی نکہت چمن سے اُڑ کے جا چمکی ستارے میں

مرے پہلو میں دِل ہے یا کوئی آئینہ جادُو کا

تری صورت نظر آئی مجھے اپنے نظارے میں

اُتارا مَیں نے زنجیرِ رسُومِ اہلِ ظاہر کو

ملا وُہ لطفِ آزادی مجھے تیرے سہارے میں

نہاں تھا تُو تو روشن تھا چراغِ زندگی میرا

مگر موجِ نفس پوشیدہ تھی تیرے نظارے میں

اُٹھایا ذوقِ تپش پتنگے سے شمع سے شوقِ اشکباری

کہیں سے سیکھی نماز مَیں نے، لیا کہیں سے سبق وضُو کا

جو چاک میرے جگر کے دیکھے کلی نے بادِ صبا سے پُوچھا

یہ آدمی ہے کہ گُل ہے منّت پذیر ہے سوزنِ رفو کا

ہاں اے شرابِ عشق یہ دن ہیں نمود کے
ایسی اُچھل کہ خلوتِ مینا بھی چھوڑ دے
مینارِ دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ
یہ انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے

(مخزن مئی ۱۹۰۵ء)

عجب تماشا ہے مجھ کافرِ محبت کا
صنم بھی سُن کے جسے رام رام کرتے ہیں

ہوا جہاں میں ہے بیکار آفریں کیسی
کہاں عدم کے مسافر مقام کرتے ہیں

رہینِ لذّتِ ہستی نہ ہو کہ مثلِ شرر
یہ راہ ایک نفس میں تمام کرتے ہیں

نظارا لالے کا تڑپا گیا مرے جی کو
بہار میں اسے آتش بجام کرتے ہیں

جہاں کو ہوتی ہے عبرت ہماری ہستی سے
نظامِ دہر میں ہم کچھ تو کام کرتے ہیں

نہ قدر ہو مرے اشعار کی گراں کیونکر
پسند ان کو وزیر نظام کرتے ہیں

(دکن ریویو۔ ستمبر ۱۹۰۵ء)

بانگ درا میں اس غزل کے صرف چھ شعر شائع ہوئے ہیں۔

حذف شدہ اشعار یہ ہیں:۔

اے تماشائی مری پستی کا نظارا تو دیکھ
اسفلِ عالی نظر ہُوں ناقصِ کامل ہُوں میَں

تم نے تاکا دل کو لیکن اُف رے شوقِ تیرِ عشق
دل سے کہتا ہے جگر تو دِل نہیں ہے دِل ہُوں میَں

تجھ میں پوشیدہ ہے لیلےٰ اور ہے لیلیٰ کوئی
کہہ رہا ہے دِل ترا لیلےٰ نہیں محمل ہُوں میَں

کشتِ آزادی کی بجلی تھی مری تقلید ہی
پھُونک ڈالی اپنی کھیتی آہ کیا غافل ہُوں میں

میں وُہی ہُوں ہو گیا تھا جس کا دِل صُبحِ الست
اب نہ پہچانو تو تُم جانو وُہی بے دِل ہُوں میں

ہے عبث اے برق تجھ کو میرے حاصل کی تلاش

مجھ پہ آ گر گر کہ اپنا آپ ہی حاصل ہوں میں

تخم ریزی جس کی ہنگام صدائے کُن ہوئی

اس پرانے مزرعِ زرخیز کا حاصل ہوں میں

جانتا ہوں جلوۂ بے پردہ ہے کاشانہ سوز

سادگی دیکھو کہ پھر دیدار کا سائل ہوں میں

(زمانہ کانپور نومبر ۱۹۱۵ء)

طور پر تو نے جو اے دیدۂ موسیٰ دیکھا
وہی کچھ قیس نے دیکھا پسِ محمل ہو کر

میری ہستی ہی جو تھی میری نظر کا پردہ
اُٹھ گیا بزم سے میں پردۂ محفل ہو کر

عین ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا
حق دکھایا مجھے اس نقطے نے باطل ہو کر

خلق معقول ہے محسوس ہے خالق اے دل

دیکھ نادان ذرا آپ سے غافل ہو کر

لاکھوں طرح کے لُطف ہیں اس اضطراب میں

تھوڑی سی دیر اور ہو خط کے جواب میں

زلفِ دراز حُسن پہ یُوں طعنہ زن ہوئی

تیری طرح سے ہم نہ رہیں گے حجاب میں

کیوں وصل کے جواب پہ چُپ لگ گئی تمھیں

دو چار گالیاں ہی سُنا دو جواب میں

اچھا ہُوا یہیں سے نکیرین چُپ ہوئے

کچھ بات بڑھ چلی تھی سوال و جواب میں

آئینہ رکھ کے سامنے زلفیں سنوار تُو

تیری بلا سے کوئی رہے پیچ و تاب میں

(نشتر۔ دسمبر ۱۹۰۶ء)

کب ہنسا تھا کہ جو کہتے ہو کہ رونا ہوگا
ہو رہے گا مری قسمت میں جو ہونا ہوگا

خندۂ گُل پہ مجھے آج تو ہنس لینے دو
پھر اسی بات پہ رو لوں گا جو رونا ہوگا

ہم کو اقبالؔ مُصیبت میں مزا مِلتا ہے
ہم تو اس بات پہ ہنستے ہیں کہ رونا ہوگا

تری شکست ہی منظور تھی اسے اے دل
بنا دِیا تجھے نازک تر آب گینے سے

جہاں سے ملتی تھی اقبالؔ رُوحِ قنبرؓ کی
مجھے بھی ملتی ہے روزی اسی خزینے سے

ہمیشہ وردِ زباں ہے علیؑ کا نام اقبالؔ!
کہ پیاس رُوح کی بجھتی ہے اس نگینے سے

ان میں سے اکثر قطعات مولوی عبدالرزّاق کی مرتبہ کلیاتِ
اقبالؔ سے اور بعض دوسری جگہ سے لئے گئے ہیں :-

(۱)

اخبار میں یہ لکھتا ہے لندن کا پادری

ہم کو نہیں ہے مذہبِ اسلام سے عناد

لیکن وہ ظُلم ننگ ہے تہذیب کے لئے

کرتے ہیں ارمنوں پہ جو تُرکانِ بد نہاد

مُسلم بھی ہوں حمایتِ حق میں ہمارے ساتھ

مٹ جائے تا جہاں سے بنائے شر و فساد

سُن کر یہ بات خوب کہا شاہ[1] نواز نے

بلّی چُوہے کو دیتی ہے پیغامِ اتحّاد

---

[1] میاں شاہ نواز بیرسٹرایٹ لا، لاہور

(۲)

بختِ مسلم کی شبِ تار سے ڈرتی ہے سحر
تیرگی میں ہے شبِ دیدۂ آہُو کی طرح
ہے اندھیرے میں فقط مولوی صاحب کی نمود
بن کے شمس العلماء چمکے ہیں جُگنو کی طرح

(۳)

ہند کی کیا پُوچھتے ہو اَے حسینانِ فرنگ
دِل گراں، ہمت سبک، ووٹر فزوں، روزی تنگ
بے ٹکٹ بے پاس بھارت کی سیاسی ریل میں
ہو گیا آخر میتا بھی مع اسباب "بُک
"ٹک وِدِن" کا حکم تھا اس بندۂ اللہ کو
اب یہ سُنتے ہیں نکلنے کو ہے "مُسلم آوٹ لُک"

کیا عجب پہلے ہی لیڈر میں یہ کر دے آشکار

کس طرح آیا کو لے کر اُڑ گیا صاحب کا گُگ

ختم تھا مرحوم اکبر پر ہی یہ رنگِ سخن

ہر سخن وَر کی یہاں طبعِ رواں جاتی ہے رُک

قافیہ اک اَور بھی اچّھا تھا لیکن کیا کریں

کر دیا متروک دِلّی کے زباں دانوں نے ٹک

(۴)

عمل عاشقوں کے ہیں بے طور سارے   نہیں اُس کمیٹی کا کوئی ایجنڈا

تمھیں سند سرمایہ دار و مُبارک   سلامت رہے مجھ کو فیجی، یوگنڈا

مَیں ڈنڈے پہ شاکر تو انڈے پہ راضی

مرا پیر ڈنڈا، ترا پیر انڈا

---

(۵)

پٹی خوب جُمّن کے ہاتھوں نصیبن　　گئی عُرس میں اور شب بھر نہ آئی

نہیں بار صاحب کے ٹیبل پہ اس کو　　پڑی رُوپ بسکٹ کا دھارے خطائی

خُدا کی زمیں تھی مزارع نے جوتی

کمائی مگر چودھری جی نے کھائی

(۶)

جناب شیخ کو پلواؤ خاص لندن کی

عجیب نسخہ ہے یہ خود فراموشی کے لئے

ہمارے حق میں تو جینا بتر ہے مرنے سے

جو زندہ ہیں تو فقط آپ کی خوشی کے لئے

ہُوا مَیں جینے سے بیزار جب تو فرمایا

کہاں سے لاؤ گے بندوق خودکشی کیلئے

(۷)

یہ قطعہ علاّمہ مرحوم نے عطیہ بیگم کو ایک خط میں لکھا تھا۔ چنانچہ عطیہ بیگم کے نام علاّمہ کے جو خطوط شائع ہوئے ہیں اس مجموعے میں یہ قطعہ موجود ہے

مندمل زخمِ دلِ بنگال آخر ہو گیا
وہ جو تھی پہلے تمیزِ کافر و مومن ، گئی
تاجِ شاہی یعنی کلکتّے سے دہلی آگیا
مِل گئی بابو کو دھوتی اور پگڑی چھن گئی

(۸)

محنت و سرمایہ دُنیا میں صف آرا ہو گئے
دیکھیے ہوتا ہے کس کس کی تمنّاؤں کا خون
حکمت و تدبیر سے یہ فتنۂ آشوب خیز
ٹل نہیں سکتا وَقَدْ کُنْتُمْ بِہٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ

کھل گئے یاجُوج اور ماجُوج کے لشکر تمام
چشمِ مسلم دیکھ لے تفسیر حرفِ یَنسِلُون

(۹)

ہے قوم جسم سلطنت اس میں ہے مثلِ رُوح
جب یہ نہیں تو قوم نہیں بلکہ لاش ہے
سعیِ شغال و گرگ سے جُنبش ہوئی اگر
نافہم سمجھے قوم میں خود انتعاش ہے
البتّہ زندگانیٔ شخصی کا ہے وجُود
قانون میں ہر اِک کے لئے زِندہ باش ہے
پیمانہ ہائے ساختۂ شاہِ وقت پر
محدود طالبین کی فکرِ معاش ہے
بے عِلم مذہبی کے ہیں اخلاق نادرست

اس کی خرابیوں سے تو دل پاش پاش ہے

کچھ خاک میں ملیں گے تو کچھ ہوں گے جُزوِ غیر

یہ مسئلہ صحیح ہے گو دِل خراش ہے

اپنی یہ احتیاط کہ بوسہ پہ اکتفا

اس پر بھی یہ عتاب کہ تُو بدمعاش ہے

(زمانہ جولائی ۱۹۲۰ء)

(۱۰)

گاندھی سے ایک روز یہ کہتے تھے مالوی

کمزور کی کمند ہے دُنیا میں نارسا

نازک یہ سلطنت صفتِ برگِ گُل نہیں

لے جائے گلستاں سے اڑا کر جسے صبا

گاڑھا ادھر ہے زیبِ بدن اور زِرہ اُدھر

صرصر کی راہ گذار میں کیا عرض ہو بھلا
پس کر ملے گا گردِ رہِ روزگار میں

دانہ جو آسیا سے ہؤا قوّت آزما
بولا یہ بات سُن کے کمال وقار سے

وُہ مردِ پختہ کار و حق اندیش و باصفا
خارا حریف سعی ضعیفاں نمی شود
صد کُوچہ ایست در بُنِ دنداں خلال را

(۱۱)

کہی ابھّی نقیبِ انجمن نے
وُہ سمجھے گا اسے جو کارداں ہے
خدا واحد ہے دو ناظم ہیں اپنے
دو عملی میں ہمارا آشیاں ہے

(۱۲)

اِتنی خدمت کی ہے خلق اللہ کی
دیکھیئے ہوتے ہیں کب سر مالوی

مسلمِ ناداں کو کیا معلوم ہے　　کس خدا کے ہیں پیمبر مالوی
خوب تھا یہ خالصہ جی کا بچن　　کب ہیں گاندھی کے برابر مالوی
مردِ میداں گاندھیِ درویش خُو
اور کونسل کے سپیکر مالوی

(۱۳)

دستور تھا کہ ہوتا تھا پہلے زمانے میں
مُلّا کا، محتسب کا، خدا کا، نبی کا ڈر
دو خوف رہ گئے ہیں ہمارے زمانے میں
مضموں نگار بیوی کا، سی آئی ڈی کا ڈر

(۱۴)

انساں ہوئے مہذّب لیکن مزہ تو جب ہے
جنگل میں کہہ رہی تھی ہاتھی سے کل یہ ہتھنی

تقریر کو کھڑی ہو کلّوُ میاں کی بیوی
پردھان ہو سبھا کی بنسی کی دھرم پتنی

(۱۵)

آساں ہے اب تو ہندو و مُسلم کا اتّحاد
کعبے کو پھر شریف نے بُتخانہ کردیا

جوشِ جنوں میں آج سُنادی پتے کی بات
تو نے کمال اے دلِ دیوانہ کردیا

کہتا تھا کوئی یونیورسٹی کے ہال میں
ڈگری دِلا کے دِین سے بے گانہ کردیا

(۱۶)

بانگ درا کی نظم "گائے اور اُونٹ" کا دسواں شعر ؎

جان بُل ہانکتا ہے ایک ہی لاٹھی سے ہمیں
یعنی ہے یک جہتی ان کی حکومت کا شعار

(۱۷)

سمجھ میں آگئی تیرے پہیلی رازِ قدرت کی
مگر یہ بھی کبھی سوچا ہے تُو خود بھی پہیلی ہے
مَیں اے اقبالؔ! دق آیا ہُوں اُن اردو نویسوں سے
جو ہو اخبار روزانہ تو کہتے ہیں کہ ڈیلی ہے

(۱۸)

ہر محکمے میں عُہدے تقسیم ہوں برابر
ہوتی نہیں ہے ہم کو جنگ و جدل سے سیری
خفیہ پولس میں جب سے حد ہو گئی ہے قائم
ہندو ہیں ہیڈ افسر مُسلم ہیں آنریری

(۱۹)

یُوں مسئلہ زبان کا حضرت نے حل کیا — پُوچھا جو مَیں نے کوئی طریقہ بتائیے
پنجابی گھر میں بولئے اُردو سٹیج پر — سینسز کے کاغذات میں ہندی لکھائیے

(۲۰)

اقبال نے مزاج جو پوچھا تو شیخ نے
موزوں کیا یہ شعر زبانِ سلیس میں

نیلام خرقہ چندۂ ٹرکی کے واسطے
عمامہ رہنِ مدرسہ بیٹوں کی فیس میں

(۲۱)

اغراضِ مختلف کی ہے پیکار ہند میں
ہر قوم پائے بند رسُوم و قیوُد ہے

ممکن نہیں کہ صُلح ہو انجن کے دَور میں
نقصان یکّہ بان کا گھوڑے کا سُود ہے

(۲۲)

ممکن نہیں کہ ایک ہی بازار میں چلیں
ہم سکّے اَور دھات کے وُہ اَور دھات کے
مخلوط انتخاب سے ہے نا اُمید ہند
پابند، یاں کے ووٹ بھی ہیں چھُوت چھات کے

(۲۳)

ووٹوں پہ منحصر نہیں کونسل کی ممبری

عُہدہ ہے یہ جدید، جدید امتحان ہے

ہے شیخ کم زبان، برہمن زباں دراز

اس بات میں وُہ جیتے گا جو کم زبان ہے

(۲۴)

انساں نے سیکڑوں جم و دارا کئے پسند

کچلا اسے جنھوں نے عذابوں کے بوجھ سے

دریائے ہست و بُود کی رفتار ہے وُہی

دبتی ہے سطحِ آب حبابوں کے بوجھ سے

(۲۵)

حشر کی آمد

آغا حشر کاشمیری جب لاہور میں پہلی بار آئے تو یہاں کی بزمِ ادب نے استقبالیہ مجلس منعقد کی۔ اقبالؔ بھی اس میں شریک تھے۔ مقررہ وقت پر حاضرین نے بے تابی سے شور مچایا۔ "آغا حشر کو بلاؤ"۔ اقبالؔ نے اُٹھ کر فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

شور ایسا ہے کہ قصابوں کی ہو جیسے برات
آئیے لاہور کی یہ بزمِ ماتم دیکھئے!

(۲۶)

مُسلم اقلیّت

مولانا ظفر علی خاں کا بیان ہے کہ ۱۲ر جولائی ۱۹۱۱ء کی رات کو وُہ علامہ اقبالؔ کے ہاں بیٹھے تھے۔ کاسہ لیسانِ ازلی کا ذکر چھڑ گیا۔ اور دہلی دربار کی تصویر سامنے آگئی۔ باتوں باتوں میں ایک ساجھے کی نظم مرتّب ہوگئی۔ جس کے کچھ شعر مولانا کے اور کچھ علامہ اقبالؔ کے ہیں ؎

ہمارے شاہ کا ہمسر نہ دارا ہے نہ خسرو ہے
کہ اس کی ذات پر نازاں بساطِ کہنہ و نو ہے
اگر اس کی غلامی کے لئے نواب جُھکتے ہیں
تو راجاؤں نے بھی چھدوائی اپنے کان کی لَو ہے
کئی مسلک کئے ہیں لازمی تعلیم نے پیدا

احمدشہ کا کوئی پٹھو، کوئی آغا کا بیرو ہے
عجب ہے کھیل قسمت کا کہ پچپیسی الیکشن کی
بچھائی شیخ بے چارے نے لالہ کو پڑی پو ہے
حصول جاہ و عزت جب وفاداری کا مقصد ہو
وُہ جنسِ ناروا گندم نہیں، گندم نما جَو ہے
نہیں ہے بہرِ اظہارِ وفا لازم نمود اصلا
کہ بحرِ شعر میں پانی نہیں مطلق مگر رَو ہے
ملے گی تشنۂ عزت کو کب اعزاز کی قفلی
مہینہ جُون کا ہے اور یہ سرگرم تگ و دَو ہے
مبارک ہے یہ جشنِ تاج پوشی جس کے صدقے میں
وُہ مسجد تک چلا آیا کلب گھر کا جو رہرو ہے
مسلمانوں کی جمعیت اگر کم ہے تو کیا پروا

عدد سَو کے چھیاسٹھ ہوں مگر مفہُوم تو سَو ہے

نہیں ہوتے ہیں لیڈر ان میں پیدا قابلیت سے

مسلمانوں میں یہ مخلوق مثلِ سبزہ خودرَو ہے

خوشامد نے جلا ڈالا ہے خودداری کے خرمن کو

ذراسی شمع ہے کم بخت اور کتنی بڑی لَو ہے

ضرورت کچُھ نہ کچُھ دُنیا میں ہے عصمت فروشوں کی

یہ رُوحانی قدمچہ ہے، یہ اخلاقی بدرَرو ہے

پُرانی روشنی میں دیکھ لو ہے پختگی کیسی

کہ پہلے دِن سے مہر و ماہ میں قائم وُہی ضو ہے

(چٹان لاہور - ۲۵ر اپریل ۱۹۶۵ء)

قطعاتِ تاریخ

سر سیّد احمد

تاریخ وفات ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء

"اِنّی مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَہِّرُکَ"

۱۳۱۵ھ

مولانا حالی مرحوم نے "حیات جاوید" میں اس تاریخ کا ذکر تو کیا ہے مگر نام نہیں بتایا۔ منشی وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی نے جو کتاب بنام "سرسیّد کا ماتم" شائع کی تھی۔ اس میں صاف لکھا تھا کہ "یہ تاریخ منشی محمد اقبال صاحب طالبعلم گورنمنٹ کالج لاہور تلمیذ حضرت داغؔ کی ہے۔ چونکہ جس آیت سے یہ مادۂ تاریخ اخذ کیا گیا ہے وہ حضرت عیسیٰؑ کی ذات سے تعلّق رکھتی ہے اسلئے بعض علماء کے اعتراض کرنے پر علاّمہ نے دوسرا مادۂ تاریخ یہ نکالا:۔

کَاَنَّہٗ مَسِیْحٌ لِکُلِّ مَرَاض

۱۳۱۵ھ

مثنوی عقدِ گوہر یعنی موتیوں کا ہار

تصنیف پیرزادہ محمد حسین صدّیقی جج ہائی کورٹ جموّں وکشمیر

مرحبا اے ترجمانِ مثنوئ معنوی ہست ہر شعر تو منظورِ نگاہِ انتخاب

از پئ نظارۂ گلدستۂ اشعارِ تو حُسن گویائی زروئے خویش بردارد نقاب

بہرِ سالِ طبع قرآن زبانِ پہلوی

بلبل دل می سراید "تِلكَ آیات الکتاب"

۱۳۱۷ھ

ولہٗ

میرے مخدوم و مکرّم نے لکھی ایسی کتاب شاہد لیلائے عرفاں کا جسے محمل کہیں

ہے مصنّف نخل بند گلشنِ معنی اگر مزرعِ کشتِ تمنّا کا اسے حاصل کہیں

از پئے تاریخ ہاتف نے کہا اقبال کو

زیب دیتا ہے اگر "مرغوب اہلِ دل" کہیں

۱۳۱۸

عقدِ گوہر

کتاب مولوی معنوی را شفیقے ما چو در اردو رقم کرد
زباں رانقش از تیر غفلت مصوں چوں طائرِ بامِ حرم کرد
سروشِ دل رقم زد بہرِ تاریخ
خیابانے زبستانِ عجم کرد
۱۳۱۷ھ

ولہ

غیرتِ نظمِ ثریا ہے یہ نظمِ دلکش
خوبیٔ قول اسی نظم کی شیدائی ہے
فکرِ تاریخ میں میں سر بگریباں جو ہوا
کہہ دیا دل نے یہ خضرِ رہِ دانائی ہے
۱۹۰۰ء

عقدِ گوہر

بزمِ سخن میں اہلِ بصیرت کا شور ہے　　یہ نظم ہے کہ چشمِ فصاحت کا نور ہے

مَیں نے کہا یہ دل سے کہ اے مایۂ ہنر　　تاریخ سالِ طبع کا لکھنا ضرور ہے

ہاتف نے دی صدا سرِ اعدا کو کاٹ کر[1]

حقّا یہ نظم موجِ شرابِ طہور ہے

۱۹۰۱

ولہ

رُوحِ فردوس میں رُومیؔ کی دُعا دیتی ہے

آپ نے خوب کیا خوب کہا خوب لکھا

دردمندانِ محبّت نے اسے پڑھ کے کہا

نقشِ تسخیر پئے طالب و مطلوب لکھا

---

[1] مادّۂ تاریخ کے ۱۹۰۱ عدد بنتے ہیں۔ اس میں سے اعدا کے پہلے حرف یعنی الف کا ایک عدد کم کرنے سے مدّعا حاصل ہوتا ہے۔ یعنی ۱۹۰۰ء جو کتاب کا سالِ تصنیف ہے۔

ہاتفِ غیب کی امداد سے ہم نے اقبالؔ
بہرِ تاریخِ اشاعت "سخنِ خوب" لکھا
۱۳۱۸ھ

امیرمینائی

تاریخ وفات ۱۷ر نومبر ۱۹۰۰ء (۱۳۱۸ھ)

"لِسَانَ صِدقٍ فِي الآخِرِينَ"
۱۳۱۸ھ

داغ دہلوی

تاریخ وفات ۲۹ر ذی الحج ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۵ء)

"نواب میرزا داغؔ"
۱۳۲۲ھ

شالامار باغ

مصنفہ منشی محمد دین فوقؔ

حسنِ سعیِ فوقؔ را صد مرحبا ہست ہر سطرِ کتابش دل رُبا

از سرِ نازش پئے تاریخ او می سزد "تصویرِ باغِ جاں فزا"[1]

(۵۰ + ۱۸۵۱ = ۱۹۰۱ء)

پیر حیدر شاہ (جلال پور شریف ضلع جہلم)

تاریخ وفات ۶ جمادی الثانی ۱۳۲۶ھ (سنہ ۱۹۰۷ء)

ہر کہ بر خاکِ مزار پیر حیدر شاہ رفت

تربتِ او را زمینِ جلوہ ہائے طُور گفت

---

[1] "تصویر باغ جانفزا" کے ۱۸۵۱ عدد ہیں۔ ان میں سرِ نازش یعنی "ن" کے پچاس جمع کیئے جائیں تو کتاب کی تاریخ طبع سنہ ۱۹۰۱ء بنتی ہے۔

ہاتف از گردوں رسیدہ خاک اُورا بوسہ داد
گفتمش سال وفات او، بگو "مغفور گفت"
۱۳۲۶ھ

کلامِ فوق[1]

جب چھپ گیا مطبع میں یہ مجموعۂ اشعار — معلوم ہُوا مُجھ کو بھی حالِ نضرِ[2] فوق
شُستہ ہے زبان جُملہ مضامین ہیں عالی — تعریف کے قابل ہے خیالِ نضرِ فوق
تاریخ کی مُجھ کو جو تمنّا ہوئی اقبال
ہاتف نے کہا لکھ دے "کمالِ نضرِ فوق"
۱۳۲۷ھ

---

[1] منشی محمد الدین فوق مدیر اخبار کشمیری لاہور؛ [2] نضر کے معنی حسن و خوبی، تازگی اور زیبائی وغیرہ ہیں۔ اسے بعضوں نے غلطی سے "نظر" بنا دیا تھا۔ جس سے مادۂ تاریخ میں ایک سو عدد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ (قریشی)

ظہیر دہلوی[1]

تاریخ وفات ۱۹ مارچ ۱۹۱۱ء (۱۳۲۹ھ)

زبدۂ عالم ظہیر دہلوی
۱۳۲۹ھ

شیخ عبد الحق

چوں مے جام شہادت شیخ عبد الحق چشید ... باد بر خاکِ مزارش رحمتِ پروردگار

با عزیزاں داغِ فرقت داد در عینِ شباب ... آستیں ہا از دُرِ اشک غمش سرمایہ دار

بندۂ حق بود ہم خدمت گذار قوم خویش

سال تاریخ وفات او ز "غفران" آشکار
۱۳۳۱ھ

---

[1] سید ظہیر الدین حسین ظہیر دہلوی شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے۔ داغ کے شاگرد جن میں اقبال بھی شامل تھے انھیں اپنے اُستاد کی طرح واجب التعظیم جانتے تھے۔

نواب وقار الملک

تاریخ وفات ۲۷ و ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء کی درمیانی شب

نواب وقار ملک و ملت   افشاند سوئے جناں رکابش

بر لوحِ مزارِ اُو نوشتم   انجام بخیر باخطابش

"وقار الملک انجام بخیر"
۱۳۳۵ھ

سُلطان اسماعیل جانؒ

از جہاں شہزادہ اسماعیل رفت   آں امیر ابنِ امیر ابنِ امیر

از فلک آمد بگوشِ من ندا   سال آں مغفور را مغفور گیر
۱۳۲۶ھ

لاہور میں شاہ ابو المعالیؒ کے مزار کے متصل سرِراہ ایک قدیم چار دیواری کے اندر کابل کے ایوب شاہی خاندان کی قبریں ہیں۔ ان میں ایک قبر سلطان اسماعیل جان کی ہے۔ جس کے تعویذ پر اقبال کا یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے۔

جسٹس میاں شاہ دین ہمایوںؒ

تاریخ وفات ۲؍ جولائی سنہ ۱۹۱۸ء (۱۳۳۶ھ)

دوشش بر خاکِ ہمایوں بلبلے نالید و گفت

اندریں ویرانہ ماہم آشنائے داشتیم

یہ شعر اقبال نے لوحِ مزار کے لئے تجویز کیا تھا۔ مگر اس سے کوئی تاریخ برآمد نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے بعد میں یہ قطعے کہے ؎

چو سالِ فوتِ ہمایوں دلِ حزیں می جست

زہست خلد ندایم رسید "المومن"

المومن کے اعداد ۱۶۷ ہیں۔ ان کو آٹھ سے ضرب دی جائے تو سنہ ۱۳۳۶ھ تاریخ نکلتی ہے ؎

درگلستانِ دہر ہمایونِ نکتہ سنج آمد مثالِ شبنم و چوں بوئے گل رسید

می جست عندلیب خوش آہنگ سالِ فوت
"علامۂ فصیح" زہر چار سُو شنید

"علاّمۂ فصیح" کے اعداد ۳۳۴ ہیں۔ انھیں چار سے ضرب دیں تو ۱۳۳۶ھ مطلوبہ تاریخ برآمد ہو جائے گی۔

سیّد نادر حسینؑ تحصیلدار

۲۸ جولائی ۱۹۱۸ء

سیّدِ والا نسب نادر حسین
در رہِ صدق و صفا جولا نگرے

چوں جدِ خود از جہاں مظلوم رفت
آں گروہِ صادقاں را سرورے

گفت ہاتف مصرعِ سالِ رحیل

کشت سیّد را یزید کافرے[1]

[1] چونکہ سیّد نادر حسین کو کسی سازش میں شہید کر دیا گیا تھا اس لئے اقبال نے اپنے مکتوب مورخہ ۷ فروری ۱۹۱۹ء کو اس مادۂ تاریخ کو الہامی قرار دیا ہے۔

ذوالفقار گنج

نواب سر ذوالفقار علی خاں رئیس مالیر کوٹلہ اقبالؔ کے گہرے دوست تھے
اُنھوں نے لدھیانہ میں ایک سرائے ذوالفقار گنج تعمیر کرائی۔ اقبالؔ نے تاریخ کہی

بانی ایں خوش بنا سر ذوالفقار | سال تعمیرش ز ہاتف خواستند
از فلک تاریخ چوں شبنم چکید | بر زمیں خلد بریں آراستند

۱۹۲۱ء

مسجد داتا گنج بخشؒ لاہور

سال بنائے حرمِ مومناں | خواہ ز جبریل وز ہاتف مجو
چشم بہ "المسجد الاقصیٰ فگن | الذی بارکہ" ہم بگو

۱۳۴۰ھ

مہاراجہ کشن پرشاد

کے مدارالمہام حیدرآباد (دکن) ہونے پر

صدرِ اعظم گشت شادِ نکتہ سنج
ناوکِ او دشمناں را سینہ سفت

سال ایں معنی سروش غیب داں
"جانِ سلطاں سرکشن پرشاد گفت"

۱۳۴۰ھ

بیگم میاں احمد یار دولتانہ رئیس لڈن

۳۰ر جمادی الاوّل ۱۳۴۲ھ مطابق ۸ر جنوری ۱۹۲۴ء روز سہ شنبہ بمقام لاہور

رخت سفر چو مادرِ ممتاز بست و رفت

زیں کارواں سرائے سوئے منزلِ دوام

پرسیدم از سروش زسالِ رحیلِ اُو

گفتہ بگو کہ: "تربتِ او آسماں مقام"

۱۳۴۲ھ

تاریخِ فتح سمرنا

شاخِ ابراہیم را نمِ مصطفےٰ ۔ مہدیٔ آخر زماں ہم مصطفےٰ

گوش کن اے بے خبر تاریخ فتح ۔ گفت اقبالؔ "اسمِ اعظم مصطفےٰ"

۱۳۴۲ھ

زوجۂ اقبال

وفات ۲۱ر اکتوبر ۱۹۲۴ء (۲۱ر ربیع الاول ۱۳۴۳ھ)

اے دریغا زمرگ ہم سفرے ۔ دلِ من در فراق او ہمہ درد

ہاتف از غیب داد تسکینم ۔ سخن پاکِ مصطفےٰ آورد[1]

بہر سالِ رحیلِ او فرمود ۔ بشہادت رسید و منزل کرد

۱۳۴۳ھ

[1] اس اہلیہ کا نام مختار بیگم تھا۔ انتقال زچگی کی حالت میں ہوا تھا۔ اس لئے سخن پاک مصطفیٰ میں حدیث شریف المبطون شہید کی طرف اشارہ ہے۔ قبر لدھیانہ میں ہے۔

مشہور مُستشرق ڈاکٹر ای جی براؤن

تاریخ وفات ۶ر جنوری ۱۹۲۶ء

نازشِ اہلِ کمال ای، جی براؤن　　فیضِ او در مغرب و مشرق عمیم
مغرب اندر ماتمِ او سینہ چاک　　از فراقِ او دلِ مشرق دو نیم
تا بہ فردوسِ بریں ماوی گرفت　　گفت ہاتف ذٰلك الفوز العظیم
۱۹۲۶ء

والدِ اقبالؒ

شیخ نور محمد تقریباً ایک سو سال کی عمر پاکر ۷ر اگست ۱۹۳۰ء کو سیالکوٹ میں فوت ہوئے

پدر و مرشدِ اقبالؒ ازیں عالم رفت　　ما ہمہ راہرواں، منزلِ ما ملکِ ابد
ہاتف از حضرتِ حق خواست دو تاریخِ رحیل
آمد آواز "اثرِ رحمت" و "آغوشِ لحد"
۱۳۴۹ھ　　۱۳۴۹ھ

منشی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور

تاریخ وفات ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء بمقام لاہور

سحر گاہاں بہ گورستاں رسیدم ۔ درآں گورے پُر از انوار دیدم
زہاتف سالِ تاریخش شنیدم ۔ ”مُعلّٰے تربت محبوب عالم“
۱۳۵۱ھ

لیڈی شہاب الدّین

رفیقہ حیات آنریبل چودھری سر شہاب الدین صدر پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی

تاریخ وفات ۱۲ مارچ ۱۹۳۵ء

چو رخت سفر بست سردار بیگم ۔ ازیں دار فانی سوئے باغِ جنّت
بہ پسماندگان تلخ شد زندگانی ۔ ”ہجومِ غم و رنج“ شد سال رحلت
۱۳۵۴ھ
سن عیسوی خواستم چوں زہاتف ۔ بگفتا: ”بریں تربتِ پاک رحمت“
۱۹۳۵ء

والدۂ جاوید اقبال

تاریخ وفات ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء

راہیٔ سوئے فردوس ہوئی مادرِ جاوید
لالے کا خیاباں ہے مرا سینۂ پر داغ
ہے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار
اقبالؔ نے تاریخ کہی "سرمۂ مازاغ"
۱۳۵۴ھ

والدۂ جاوید اقبال کو لاہور کے مشہور قبرستان بیبیاں پاک دامناں میں ایک بلند ٹیلے پر دفن کیا گیا۔ جہاں اُن کے سنگِ مزار پر حاجی دین محمد کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے۔

سر راس مسعود کی دختر نادرہ مسعود کی پیدائش پر

یکم مارچ ۱۹۳۷ء

راس مسعود جلیل القدر کو ۔۔۔ جو کہ اصل و نسل میں مجدود ہے
یادگار سیدِ والا گہر ۔۔۔ نورِ چشم سیدِ محمود ہے
راحت و جانِ جگر دختر ملی ۔۔۔ شکر خالق، منتِ معبود ہے
خانداں میں ایک لڑکی کا وجود ۔۔۔ باعثِ برکاتِ لا محدود ہے

کس قدر برجستہ ہے تاریخ بھی
"باسعادت دخترِ مسعود ہے"

متفرقات

متفرقات

زخارِ راہ مترس اے جوانِ ہمت خواہ ۔۔۔ بمنزلے نہ رسید آنکہ زحمتے نہ کشید

مرید صوفیِ پیرم کہ ساغرِ لبریز ۔۔۔ بلب رسا نہ ید آنساں کہ قطرۂ نہ چکید

چناں زدستِ دوئی شست لوحِ خاطرِ خویش ۔۔۔ کہ وحشیِ توہم از آہوئے خیال رمید[1]

ضبط از دلِ من بردو فرو ریخت بجانم

آن نکتہ کہ با مومن و کافر نتواں گفت[2]

برق را ایں بہ جگر می زند آں رام کند ۔۔۔ عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است[3]

تیغ لا در پنجۂ ایں کافرِ دیرینہ نہ

باز بنگر در جہاں ہنگامۂ اِلّا ئے من[4]

---

[1] روزگار فقیر حصہ دوم ص۲۲۴ ، اقبال نامہ حصہ دوم ص۴۶ ، [2] مکاتیب اقبال ص۱۶

[3] مکاتیب اقبال ص۲ ، [4] مکاتیب اقبال ص۳۲ ؛

ترسم کہ تو می دانی زورق بہ سراب اندر

زادی بہ حجاب اندر، میری بہ حجاب اندر

برکشت و بیاباں پیچ برکوہ و بیاباں پیچ

برقے کہ بہ خود پیچید میرد بہ سحاب اندر

ایں صوتِ دلآویزے از زخمہ مطرب نیست

مہجورِ جناں حورے نالد بہ رباب اندر

(۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء در دولتکدۂ عطیہ بیگم۔ بمبئی)

در چمن بُود ولیکن نتواں گفت کہ بُود

آہ زاں غنچہ کہ بادِ سحر او را نکشود[1]

نشہ از حال بگیریم و گذشتیم زقال

نکتۂ فلسفہ دُردِ تہ جام است این جا

ای کہ تو پاس غلط کردۂ خود می داری

آنچہ پیش تو سکون است حرام است این جا

---

[1] بیگم مسعود کے مردہ بچہ پیدا ہونے پر۔

ما دریں رہ نفس دہر بر انداختہ ایم　　آفتابِ سحر او لبِ بام است این جا[1]

اب مری شہرت کی سوجھی ہے کوئی دیکھے نہیں

مٹ کے میں جس دم غبارِ کوئے رسوائی ہوا[2]

شادم ز طعنِ خلق کہ مرغانِ باغِ عشق

شاخے کہ سنگ می رسدش آشیاں کند[3]

تیرے مریض کو تپِ فرقت ہے کیا لگی　　اُس کو دعا لگی نہ کسی کی دوا لگی

اقبال گر یہی ہیں حسد کی بناوٹیں　　جانے مشاعرے میں ہماری بلا لگی

نہ یہ دِلّی کی اُردو ہے نہ یہ پورب کی بولی ہے

زباں میری ہے اے اقبال بولی درد مندوں کی

رُومال کے لباس میں ابر آ کے بارہا

پانی پیا کیا مری چشمِ زلال سے

---

[1] مکاتیبِ اقبال ص۱۸ ، [2] اقبال نامہ حصّہ دوم ص۳۵۵ ، [3] اقبال نامہ حصّہ دوم ص۳۵۹

عالمِ جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ

کہیئے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

چائے سبز است کیمیائے شباب　　پیرِ صد سالہ را جواں سازد[1]

پنجاب کی کشتی کو دیا اس نے سہارا

تابندہ ہمیشہ رہے ہیلی کا ستارا

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں

خواب را مرگِ سبک داں مرگ را خوابِ گراں[2]

بہ صحن گلشن ما صورتِ بہار بیا　　کشادہ دیدۂ گل بہرِ انتظار بیا[3]

در جہاں مانند جوئے کوہسار　　از نشیب و ہم فراز آگاہ شد

یا مثالِ سیل بے زنہار خیز　　فارغ از پست و بلند راہ شو[4]

---

[1] لاہور کے ایک تاجر کے کاروباری اشتہار پر یہ شعر برسوں اقبال کے نام سے شائع ہوتا رہا ہے، [2] سر راس مسعود کے لوحِ مزار کیلئے، [3] مکتوب بنام منشی محمد الدین فوق، [4] اقبال نامہ حصہ دوم ص۴۵،

گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر — شمع بولی گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں[1]

اثر یہ تیرے اعجاز مسیحائی کا ہے اکبر — الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا[2]

اقبال میرے نام کی تاثیر دیکھئے — مَیں جس کیساتھ ہوں اسے ممکن نہیں شکست

ہے سلطنت جس کی دفن دلّی میں خود وُہ کابل میں سو رہا ہے

تجھے جہاں میں سبب ہے اک علاج قضائے چرخِ کہن نہیں ہے

مرے نالے تو ایسے تھے کہ پتھر بھی گھُل جاتے

الٰہی تیری دُنیا میں کوئی درد آشنا بھی ہے

پسند آیا مجھے اے گل ترا اندازِ خاموشی

کہ تو اس باغ میں خاموش بھی خونیں نوا بھی ہے

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم ص۵ ، [2] مکاتیب اقبال ص۹ ،

چھُپا کر حضرتِ واعظ نے رکھا شیشۂ مے کو
مرے کام آگئی آخر زمینِ زیرِ منبر بھی

گر اے شبِ سیہ تجھے حسرت ہے نام کی
کچھ قرض مانگ لے مرے بختِ سیاہ سے

تا کجا طور پہ دریُوزہ گری مثلِ کلیم
اپنی مٹی سے عیاں شُعلۂ سینائی کر

لوگ کہتے ہیں مجھے راگ کو چھوڑو اقبالؔ
راگ ہے دین مرا راگ ہے ایماں میرا